نو تاریخیت اور اردو ناول: سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں منتخب ناولوں کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم فل (اُردو)

مقالہ نگار:

حرا مگسی

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۲ء

نو تاریخیت اور اردو ناول: سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں منتخب ناولوں کا مطالعہ

مقالہ نگار:

حرا مگسی

یہ مقالہ

ایم فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

©اگست، ۲۰۲۲ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: نو تاریخیت اور اردو ناول: سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں منتخب ناولوں کا مطالعہ

پیش کار: حرا مگسی رجسٹریشن نمبر: 19666/M/U/F19

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر محمود الحسن _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر سید نادر علی _____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، حرا مگسی بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے۔ میں نے یہ مقالہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل اُردو اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الحسن کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

حرا مگسی

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوجز، اسلام آباد

اگست 2022

فہرست ابواب

مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vi
اظہارِ تشکر	vii
باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث	01
ا۔ تمہید	01
i. موضوع کا تعارف	01
ii. بیان مسئلہ	02
iii. مقاصدِ تحقیق	02
iv. تحقیقی سوالات	03
v. نظری دائرہ کار	03
vi. تحقیقی طریقہ کار	04
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	05
viii. تحدید	05
ix. پس منظری مطالعہ	06
x. تحقیق کی اہمیت	07
ب۔ نو تاریخیت: بنیادی مباحث	07
i. تاریخ اور نو تاریخیت	07
ii. نو تاریخیت کا آغاز	08
iii. نو تاریخیت کیا ہے؟	12
iv. ثقافتی مادیت	14
ج۔ مصنفین کا اجمالی تعارف	16

i. الطاف فاطمہ کی سوانحی و ادبی خدمات 16
ii. نشاط فاطمہ کی سوانحی و ادبی خدمات 23
حوالہ جات 28
باب دوم: نو تاریخیت کے تناظر میں "آنسو جو بہہ نہ سکے" اور "چلتا مسافر" کا موضوعاتی مطالعہ 31
الف۔ سقوطِ ڈھاکہ 31
i. سقوط ڈھاکہ کے ادب پر اثرات 38
ب۔ آنسو جو بہہ نہ سکے" کے عمومی موضوعات (سیاسی، سماجی، مذہبی) 40
i. سیاسی موضوعات کا مطالعہ 41
ii. سماجی موضوعات کا مطالعہ 44
iii. مذہبی موضوعات کا مطالعہ 48
ج۔ "چلتا مسافر" کے عمومی موضوعات (سیاسی، سماجی، مذہبی) 52
i. سیاسی موضوعات کا مطالعہ 52
ii. سماجی موضوعات کا مطالعہ 60
iii. مذہبی موضوعات کا مطالعہ 67
حوالہ جات 70
باب سوم: آنسو جو بہہ نہ سکے" کے عمومی کردار (سیاسی، سماجی، مذہبی) 74
i. سیاسی کردار 81
ii. سماجی کردار 83
iii. مذہبی کردار 91
ب) "چلتا مسافر" کے عمومی کردار (سیاسی، سماجی، مذہبی) 92
i. سیاسی کردار 92
ii. سماجی کردار 94
iii. مذہبی کردار 90

حوالہ جات 99
ماحصل
الف۔ مجموعی جائزہ
ب۔ تحقیقی نتائج
ج۔ سفارشات
کتابیات 106

Abstract

Topic of my research “new historiscism and urdu novels: The study of selected novels in the perspective of fall of dhaka”. In this thesis there is study of selected novels under the impact of new historicism. Two novels have been choosen by using the theory of new historicism first novel is “ansu jo beh na skey” and second is “chalta musafir” which are included in my research. My research categorized into four chapters. In first part, we have primary ligalities and introduction of authors and further more collectively review of new historicism in urdu novels. In second chapter, the thematic study of selected novels “ansu jo beh na skey” by Nishat Fatima and “chalta musafir” by Iltaf Fatima is included. In these selected novels mentioned above: I did the study of political, social and religious topics. In the third chapter study of characters is included. In this chapter, the characters of selected of novels conwayed in the perspective of politics, socialy and religion. In fourth chapter has the conclusion in which the summary and the theme of the research study has been highlighted. Infact the research highlights the selected novels in the light of new historicism.

اظہارِ تشکر

میں اللہ تعالی کا شکر بجالاتی ہوں، جس کی رحمت اور کرم کی بدولت مجھے فہم و فراست مل سکی۔ بے شک اسی کی عطا سے میں اس مقام تک پہنچی اور اپنے علمی سفر میں درپیش اس تحقیقی عمل کو مکمل کر سکی۔ اس کے ساتھ شکر ادا کرتی ہوں اپنی ماما اور پاپا کا جن کی دعاؤں، بے لوث محبتوں اور حوصلہ افزائی نے علم حاصل کرنے میں آسانیاں مہیا کیں۔ اس بے لوث رشتے کا سایہ بلاشبہ زندگی کی ہر مشکل میں ساتھ نبھاتا ہے۔ میں اپنے ان تمام احباب اور رشتے داروں کی شکر گزار ہوں جو تعلیمی سفر میں قدم بہ قدم میرے ساتھ چلتے رہے اور میری راہنمائی کے ساتھ حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

تحقیقی کام کے لیے عنوان کا انتخاب اور مواد کی جمع آوری یقیناراہنمائی کے بغیر ممکن نہیں، میں اپنے شفیق اور ملنسار نگران ڈاکٹر محمود الحسن کی تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان مراحل میں میری راہنمائی کے ساتھ کام کو سراہتے رہے۔ میں جامعہ نمل کے تمام قابل اور شفیق اساتذہ کی شکر گزار ہوں کہ مجھے اپنے سائے میں کچھ علم سیکھنے کا موقع دیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق اور قیصر عباس کی بھی ممنون ہوں جن کی رہنمائی سے میں آج اس مقام پر ہوں۔ ان مہربان اساتذہ کی شفقت اور راہنمائی میرے لیے مشعلہ راہ بنی رہی۔ اس کے علاوہ اپنے شوہر حماد خان کی بے حد مشکور ہوں جن کی مدد اور حوصلہ افزائی سے آج میرا یہ مقالہ تکمیل ہوا۔ پروف خوانی عبدالعزیز مغل ایم۔فل اسکالر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی نے کی۔

آخر میں بے حد مشکور ہوں اپنی بہن شانزہ کشف اور آمنہ رحمان اوراپنے دوست محسن علم شاہ اور ان تمام لوگوں کی جو کسی نہ کسی طرح میرے ساتھ تحقیقی کام میں معاون رہے۔

دعا گو ہوں کہ ایسے راہنما والدین، اساتذہ، دوست اور ادارے سلامت رہیں جو دوسروں کے لیے مثل کہکشاں ہیں۔ امین

حرا مگسی

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

ا۔ موضوع کا تعارف (Introduction)

تاریخ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ چاہے یہ تاریخ اقوام کی ہو یا ادب کی۔ ہر طرح کی تواریخ اپنے اندر معنویت رکھتی ہیں۔ باقی تواریخ کی طرح ادب میں لکھی جانے والی تاریخیں بھی اہمیت کی حامل ہیں کیوں کہ اس میں کسی خاص عہد کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں مختلف متون کو تواریخ کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے تاکہ مختلف ادوار میں ہونے والے سیاسی اور سماجی احوال سے آگہی ہو سکے۔ ایسے مطالعوں کے لیے تاریخیت اور نو تاریخیت جیسی اصطلاحات سامنے آتی ہیں۔ یہ اصطلاحات مغرب سے ہمارے ہاں آئی ہیں۔ مجوزہ موضوع کے تحت نو تاریخیت کے تناظر میں نشاط فاطمہ کے ناول ''آنسو جو بہہ نہ سکے'' اور الطاف فاطمہ کے ناول ''چلتا مسافر'' کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا جائے گا۔

نو تاریخیت قرات کے اس عمل کا نام ہے۔ جس کے ذریعے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح ادبی متون نہ صرف اپنے زمانے کے طور طریقوں اور اعتقادات کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان طور طریقوں اور اعتقادات کو بناتے اور متاثر کرتے ہیں۔ ہر ادب پارے میں خالی جگہیں موجود ہوتی ہیں۔ نو تاریخی ناقدین متن کے دروں میں جھانک کر ان حقائق کو سامنے لاتے ہیں جو کسی دباو کی وجہ سے سامنے نہیں آتے۔ نو تاریخیت ادبی اور غیر ادبی متون کو مساوی مقام دیتی ہے۔ نو تاریخیت حقیقت کے دوسرے رخ کو بھی سامنے لاتی ہے۔ یعنی یہ جاننا کہ ادب نہ صرف ثقافتی طور پر پیدا ہوتا ہے بلک ثقافتی اطوار بھی پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول نو تاریخیت ادب کے فنی و جمالیاتی پہلوؤں پر اعتراض کیے بغیر اس کا مطالعہ تاریخ کے وسیع تناظر میں کرنے اور ادب میں تاریخ کے علاوہ معاشرت، ثقافت اور سماج کی اہمیت پہ بھی زور دیتی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس کے بقول نو تاریخیت ادب کی فنی اور جمالیاتی پہلوؤں سے تعرض کئے بغیر اس کا مطالعہ تاریخ کے ہمہ گیر تناظر میں کرتی ہے۔

نو تاریخیت، تاریخ، ثقافت، سماج اورادب کے گہرے رشتوں کو سمجھنے سمجھانے کانام ہے۔ نو تاریخیت صرف ماضی میں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں معلومات نہیں دیتی بلکہ اس واقعے کے پس پردہ حقائق کیا ہیں اس کے بارے میں بھی معلومات پہنچاتی ہے، جس سے ہم کسی بھی واقعے کے اسباب اور اس کے محرکات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ شاملِ تحقیق ناولوں میں ۱۹۴۷ کے سیاسی واقعات اور سقوطِ ڈھاکہ کا واقعہ قابلِ توجہ ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے دیگر محرکات کو نو تاریخیت کے تناظر میں دیکھنا بھی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ نو تاریخیت میں ادب کا مطالعہ نہ صرف داخلی عنصر کے طور پر کیا جاتا ہے بلکہ داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجی عناصر کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے تاکہ ادب کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ تاریخ کے ہمہ گیر تناظر کو بھی پرکھا جاسکے۔

2۔ بیانِ مسئلہ (Statement of Problem)

نو تاریخیت کے تناظر میں متن کے اندر تاریخی عناصر کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے مجوزہ ناولوں میں نشاط فاطمہ کا ناول " آنسو جو بہہ نہ سکے" اورالطاف فاطمہ کا ناول "چلتا مسافر" کا مطالعہ مختلف حوالوں سے کیا جاچکا ہے لیکن ابھی تک نو تاریخیت کے حوالے سے مطالعہ نہیں کیا گیا۔ مجوزہ موضوع کے تحت لکھے جانے والے مقالے میں ان دونوں ناولوں کے کرداروں اور واقعات کا نو تاریخیت کے حوالے سے مطالعہ کیا جائے گا اور ان ناولوں کے موضوعات اور واقعات کا تاریخی حوالہ سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ مذکورہ ناولوں میں دیگر تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ سقوطِ ڈھاکہ کے واقعے کو خصوصی طور پر بیان کیا گیاہے۔ جن کی مدد سے سقوطِ ڈھاکہ کے تاریخی محرکات کا انداہ بھی کیا جاسکے گا، جو واقعات کا حصہ ہیں۔

3۔ مقاصدِ تحقیق (Research Objectives)

مجوزہ مقالے میں درج ذیل تحقیقی مقاصد پیشِ نظر رہے گے:

ا۔ نظریہ نو تاریخیت کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس کے مبادی تصورات اور نظری جہات کا جائزہ لینا۔

۲۔ نو تاریخیت کے تناظر میں ''آنسو جو بہہ نہ سکے'' اور ''چلتا مسافر'' کے موضوعات کا سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے جائزہ لینا۔

۳۔ نو تاریخیت کے تناظر میں ''آنسو جو بہہ نہ سکے'' اور ''چلتا مسافر'' کے کرداروں کا سقوطِ ڈھاکہ کے پسِ منظر میں مطالعہ کرنا۔

4۔ تحقیقی سوالات (Research Questions)

مجوزہ مقالے میں درج ذیل تحقیقی سوالات پیشِ نظر ہوں گے:

۱۔ نظریہ نو تاریخیت کے تحت کسی ناول کے متن کا نو تاریخی مطالعہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ نو تاریخیت کے تناظر میں منتخب ناولوں میں سقوطِ ڈھاکہ کے موضوعات کو کیسے پیش کیا گیا ہے؟

۳۔ نو تاریخیت کے تناظر میں منتخب ناولوں میں کرداروں کو کس طرح پیش کیا گیا ہے؟

5۔ نظری دائرہ کار (Theoretical Framework)

نو تاریخیت ایک بہت پھیلا ہوا موضوع ہے۔ جس کی پرورش مابعد جدیدیت کی چھتری تلے ہوئی۔ اس کے بارے میں ناصر عباس نیر اپنی کتاب "جدید اور مابعد جدید تنقید" میں لکھتے ہیں کہ "" نئی تاریخیت (New Historicism) پسِ جدید فکر کا اہم مظہر اور تھیوری ہے اور پس جدید فکر میں ساختیات کے بعض اور پسِ ساختیات کے بیش تر عناصر شامل نہیں ہے۔"۔ نو تاریخیت کے تنقیدی نظریات کو پروان چڑھانے میں دو گروہوں کا اہم کردار رہا ہے۔ ایک گروہ امریکی ہے جس کا سرخیل اہم مورخ اور نقاد اسٹیفن جے گرین بلاٹ ہے۔ اسٹیفن جے گرین بلاٹ نے ۱۹۸۲ میں ''The power of forms in the English Renaissance'' کے عنوان سے کتاب لکھی جس میں انھوں نے پہلی بار نو تاریخیت کی اصطلاح استعمال کی۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۷ میں اسٹیفن جے گرین بلاٹ نے ایک تفصیلی مضمون '' Towards a poetics of culture'' کے عنوان سے لکھا جو آج تک نو تاریخیت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ دوسرا گروہ برطانوی ہے ۔ برطانیہ میں نو تاریخیت ''ثقافتی مادیت'' (Cultural Materialism) کی تناظر میں سامنے آئی۔

برطانوی مارکسسٹ نقاد ریمنڈ ہنری ولیم نے اپنی کتاب "Marxism and Literature" میں پہلی بار "ثقافتی مادیت کی اصطلاح استعمال کی۔ ان کے ہم خیال ناقدین میں فرانسز بارکر، جوناتھن ڈولی موراور کیتھرائن بیلسی نمایاں ہیں۔ اردو میں ریاض صدیقی نے سب سے پہلے نو تاریخیت کے تناظر میں ۱۹۹۳ سے ۱۹۹۵ کے درمیان تنقیدی مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ ناصر عباس نیر، شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر قاضی عابد اور نسیم عباس احمر وغیرہ بھی نو تاریخیت پر تنقیدی مضامین لکھ چکے ہیں۔

مجوزہ تحقیقی مقالے میں برطانوی نقاد ریمنڈ ہنری ولیم کی کتاب "Marxism and Literature" میں ان کے پیش کردہ نظریے "ثقافتی مادیت" (Cultural materialism) کو نظری دائرہ کار کے طور پر سامنے رکھا جائے گا۔ ریمنڈ ہنری ویلم کی ثقافتی تھیوری ادبی تاریخ اور ادبی متن کو ایک نئے زاویے سے پیش کرنے کا امکان رکھتی ہے۔ چناں چہ تحقیقی مقالہ ہنری ولیم کے نو تاریخیت کے نظریات کی روشنی میں لکھا جا ئے گا۔ نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ کے ناولوں میں نو تاریخی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعے کے لیے صرف نو تاریخیت کے نظری اور اطلاقی مباحث ہی پیشِ نظر رہیں گے۔ جن کی روشنی میں ان ناولوں میں تاریخ و ادب کے باہمی رشتوں، انسلاکات اور رجحانات کا تجزیہ کیا جائے گا۔ اور اس سے جو حقائق یا محرکات مرتب ہوں گے ان کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ نو تاریخیت کے تناظر میں پیش کیا جائے گا۔ ان ناولوں کے کرداروں، واقعات اور ماحول کا بھی الگ الگ مطالعہ کیا جائے گا جس کے لیے نو تاریخیت کے مباحث پیشِ نظر رہیں گے جس کی روشنی میں حقائق اور محرکات کا احاطہ کرتے ہوئے نتائج مرتب کیے جائیں گے۔

6۔ تحقیقی طریقہ کار (Research Methodology)

مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے دستاویزی اور تاریخی طریقہ تحقیق سے کام لیا جائے گا۔ نو تاریخیت کے حوالے سے رسائل اور کتب تک بھی رسائی حاصل کی جائے گی اور بنیادی ماخذات میں منتخب ناولوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔ موضوع کی مناسبت سے کسی بھی تحقیقی طریقہ کار سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ناول کے کرداروں اور واقعات پر نو تاریخیت کی تھیوری کے مختلف عناصر کو استعمال کرتے ہوئے تجزیہ کیا جائے گا جس میں مختلف ناقدین کے ویڈیو لیکچرز، انٹرویوز اور انٹرنیٹ سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

7۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:(WORKS ALREADY done)

جامعاتی سطح پر نشاط فاطمہ کے ناول ''آنسو جو بہہ نہ سکے'' اور الطاف فاطمہ کے ناول ''چلتا مسافر'' کا نو تاریخیت کے تناظر میں کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ مجوزہ موضوع نو تاریخیت کے تناظر میں: منتخب ناولوں کا تحقیق و تنقیدی مطالعہ (بحوالہ ''آنسو جو بہہ نہ سکے'' اور ''چلتا مسافر'' اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نیا موضوع ہے۔ اس سے پہلے جامعاتی سطح پر جو کام سامنے آئے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

ا۔ اردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث، سید زوار شیرازی، ایم فل، ۲۰۱۸، اورینٹیل کالج، پنجاب یونیوسٹی، لاہور

۲۔ زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت، سمعیہ شکور (ایم فل)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۰

۳۔ اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت، عائشہ واحد، ایم فل، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۰

۴۔ الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری، فوزیہ انار (ایم فل)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۷

۵۔ خواب گر کا تجزیاتی مطالعہ، عمارہ افضل (مقالہ برائے ایم فل)، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۱

8۔ تحدید (Delimitation)

زیرِ نظر مقالے میں نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ کے ناولوں کا نو تاریخیت کے تناظر میں جائزہ لیا جائے گا۔ اس ضمن میں تحقیق کو نشاط فاطمہ کا ناول '' آنسو جو بہہ نہ سکے'' اور الطاف فاطمہ کا ناول ''چلتا مسافر'' تک ہی محدود رکھا جائے گا۔ جس میں سقوطِ ڈھاکہ کے موضوعات اور کرداروں کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ دیگر پہلو مقالے کا حصہ نہ ہوں گے۔

۹۔ پس منظری مطالعہ (Literature Review)

نو تاریخیت کے حوالے سے فی الحال اردو ناول پر تحقیقی و تنقیدی کام کتابی صورت میں سامنے نہیں آیا البتہ اِکا دُکا مضامین اس نوعیت کے مل جاتے ہیں جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ مضامین درج ذیل ہیں:

۱۔ ناہید قمر، ڈاکٹر، اردو ناول میں تاریخیت اور نو تاریخیت (مضمون)، مشمولہ تحقیق نامہ والیم 26، جون ۲۰۲۰ء

۲۔ نمائندہ اردو ناول نگاروں کے تاریخی شعور کے ماخذات کی تفہیم ایک مطالعہ (مضمون)، مشمولہ خیابان جامعہ پشاور، س ن

۳۔ بینش فاطمہ، اردو ادب میں نو تاریخیت کے مباحث (مضمون)، مشمولہ تحقیقی زاویے، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء

ان مقالہ جات کے علاوہ درج ذیل کتب سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

۱۔ نسیم عباس احمر، ڈاکٹر (مرتب)، نو تاریخیت، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء

۲۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

اس کے علاوہ جامعاتی سطح پر ہونے والے تحقیقی کام سے بھی استفادہ کیا ہے جن میں موضوع سے متعلقہ ایک مقالہ بہت اہم ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ ادبی تحاریک کے زیرِ اثر اردو ناول کے رجحانات و اسالیب کا انتقاد: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو)، مقالہ نگار، عامر رؤف، شعبۂ اردو جامعہ پشاور، ۲۰۱۳ء

وہ جسے چاہا گیا، الطاف فاطمہ، مشمولہ ہفت روزہ، ''لیل و نہار'' لاہور، اپریل، ۱۹۶۳،

الطاف فاطمہ ایک تعارف، ایک مطالعہ، پروفیسر سلیم الرحمن، ماہِ نو لاہور، شمارہ مارچ، اپریل، ۲۰۰۸

اردو افسانہ اور چالیس اہم افسانہ نگار، شاہین زیدی، سہ ماہی، نوادر، سالنامہ، ۲۰۱۲

10۔ تحقیق کی اہمیت (Significance of Research)

اردو ناول میں جدید تنقیدی نظریات کے تناظر میں تحقیقی و تنقیدی کام بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے اردو ناول میں نئے تنقیدی نظریات کے تناظر میں تنقیدی و تحقیقی کام کرنے کی بہت گنجائش موجود ہے۔ مجوزہ موضوع "نو تاریخیت اور اردو ناول: سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں منتخب ناولوں کا مطالعہ " پر مشتمل ہے۔ نو تاریخیت کے تناظر میں سقوطِ ڈھاکہ کا اہمیت کا حامل ہے۔ مجوزہ موضوع اس حوالے سے اہم ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا واحد کام ہو گا جس سے منتخب ناولوں میں تاریخی اور ثقافتی سطح پر نو تاریخی عناصر سامنے آئیں گے اور ان کی روشنی میں تاریخی و ثقافتی حقائق اور محرکات کا احاطہ کیا جائے گا۔ جس سے اردو ادب میں نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ کے ناولوں کے توسط سے نو تاریخی شعور بھی اجاگر ہو گا۔ جو اردو ادب میں ایک نئے اضافے کا باعث بنے گا۔

ب۔ نو تاریخیت: بنیادی مباحث

الف۔ تاریخ اور نو تاریخیت

تاریخ کیا ہے ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا واسطہ ہر ذی روح کو کرنا پڑتا ہے۔ ہر ملک و قوم کی اپنی ایک الگ تاریخ ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ادب پارے کی بھی تاریخ ہوتی ہے۔ در اصل ادب اور تاریخ کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ ہر ادب پارہ اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ کیوں کہ جب بھی کوئی ادب تخلیق کیا جاتا ہے تو وہ ادب پارہ تاریخ اور ماحول سے ہی جنم لیتا ہے۔ چناں چہ کسی بھی ادب پارے کو پروان چڑھانے میں تاریخ اور ماحول کا گہرا عمل دخل ہوتا ہے۔ اور وہ ادب جو اپنے ماحول، عہد یا زمانے سے کٹا ہوا ہوتا ہے وہ مقبولیت کی معراج کو نہیں پہنچتا۔ لیکن وہ ادب جو اپنے عہد اور زمانے کا آئینہ دار ہوتا ہے وہی ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ لہذا کسی بھی ادب کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے اس دور کی ذہنی اور سیاسی کیفیات کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ چناں چہ کوئی بھی ادب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ کسی بھی عہد میں رونما ہونے والے واقعات سے آگاہی ادب ہی کی بدولت ممکن ہے۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

ادب تاریخ کا نمائندہ ہے ادب کا وہی مطالعہ صحیح اور مناسب ہے جو تاریخی اور سماجی تناظر میں کیا جائے۔[1]

فرینک اینکر اسمتھ نے اپنی ایک کتاب narrative logic : A semantic of the Historian Languageجو کہ 1983 میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے کہا کہ تاریخ ایسے انفرادی بیان کا مجموعہ ہے۔ جس کی بنا پر متون تشکیل ہوتے ہیں، ان متون میں بعض خیالی اور من گھڑت ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے اور ماضی بعض اوقات بحیثیت زمانے کے ہمارے حواس سے باہر ہوتا ہے۔ اس لیے ان بیانات میں سچ اور جھوٹ کی تفریق کرنا قدرے مشکل کام ہے۔ ان ماخذات کی تحقیق سے ملنے والے حقائق نامکمل ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے اینکر اسمتھ کا کہنا ہے کہ "ہمارے لیے ماضی کے واقعات کا ماخذ ماضی کے وہ بیان یا کہانیاں ہیں جن میں تاریخ کو متنایا گیا ہے"

ب۔ نو تاریخیت کا آغاز:

ساٹھ کی دہائی میں ساختیات اور پس ساختیات نے نئی تنقید کو نشانہ بنایا۔ جس سے ثقافت بھی ادب کا حصہ بن گئی۔ نئی تنقید میں متن کی خاص اہمیت ہے جبکہ نئی تنقید اور ردِ تشکیل میں زبان اور ادب دونوں کو یکساں سمجھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے خلاف ردِ عمل دیکھنے کو ملا اور ایک نیا اندازِ فکر سامنے آیا۔ یہ نیا اندازِ فکر گزشتہ تمام افکار کی نفی کرتا تھا اور اس کے خلاف تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ لوگوں کو متاثر کرنا شروع کیا اور لوگوں کو سوچنے کے لیے ایک نئے انداز سے متعارف کروایا۔ جب یہ نیا اندازِ فکر لوگوں میں مقبول ہوا تو اسے "نئی تاریخیت / نو تاریخیت" کہا جانے لگا۔ گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں۔

> "نیو کرٹیسزم اور ردِ تشکیل سمیت اس تمام رویوں کے خلاف، جو فقط زبان کے خلاف یا فقط لسانیات یا فقط متنیت پر زور دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ایک بغاوت رونما ہوئی۔ اور نتیجے کے طور پر ادبی مطالعہ کا جو نیا طور سامنے آیا۔ اس کو نئی تاریخیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔"[2]

نو تاریخیت کا باقاعدہ آغاز امریکہ کے اسٹیفن گرین بلاٹ نے کیا۔ 80 کی دہائی میں انھوں نے یہ اصطلاح متعارف کروائی۔ گرین بلاٹ نے نو تاریخیت، ثقافتی مطالعات اور نشاۃ ثانیہ پر متعدد کتابیں لکھیں۔

گرین بلاٹ جب کیلیفورنیا یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے تو انھوں نے ایک جریدہ "Representation" کے نام سے نکالا جس میں ان کے ساتھ دیگر مفکرین اور نقادوں نے بھی اس میں حصہ ڈالا، جس کی وجہ سے نو تاریخی ناقدین ابھر کر سامنے آئے۔ یہ انگریزی نشاۃ ثانیہ میں متن کی بدلتی ہوئی اقسام کا تعارف تھا، جس سے نئ تاریخ سازی کو فروغ حاصل ہوا۔ اس کے تعارف میں گرین بلاٹ نے نئ تاریخیت کو نئ تنقید سے علاحدہ قرار دیا۔ کیوں کہ اس کے ذریعے متن کو خود ساختہ طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف کمال اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"یہ اصطلاح "نو تاریخیت" گرین بلاٹ نے سب سے پہلے 1982 میں The power of forms in the English Renaissance کے تعارف میں استعمال کی۔"[3]

اس کے بعد اسٹیفن گرین بلاٹ نے Renaissance of Self Fashioning from more to Shakespeare لکھی جس میں سولہویں صدی کی زندگی اور اس کے ادب کا مطالعہ کیا گیا۔ جس سے علم کا نیا در کھلا اور 1988 میں نو تاریخیت کی اصطلاح سامنے آئی۔ اس اصطلاح سے تاریخ کے ان خفیہ خانوں کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو کسی وجہ سے سامنے نہیں آسکے۔ آہستہ آہستہ نو تاریخیت ایک تھیوری بنتی گئی۔ گرین بلاٹ نے اس حوالے سے تفصیل میں لکھا۔ اپنی ایک کتاب **Toward a poetic of Culture** میں انھوں نے واضح کیا کہ New Historicism never was and never should be a Theory یعنی نو تاریخیت نہ تو کوئی تھیوری تھی اور نہ ہی کبھی اسے تھیوری بنایا جائے۔ اس کی مثال انھوں نے اس طرح دی ہے کہ سرمایہ داری کے اصولوں کو سمجھنے کے لیے صرف مارکس کے پیش کیے گئے نظریے کو ہی جاننا کافی نہیں ہے، اسی طرح نہ صرف پسِ ساختیات کے اصولوں سے سرمایہ داری کو سمجھا جاتا ہے۔ ایک اور مثال بھی انھوں نے دی کہ کسی عہد میں رونما ہونے والے واقعات اور اس دور سے متعلق اور متضاد رویوں کو جاننے کے لیے صرف ایک تھیوری سے ہی استفادہ کرنا ناکافی ہے۔ بلکہ مختلف نظریات اور تھیوریوں کے ذریعے بہترین نتائج تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اسٹیفن گرین بلاٹ کے رفقا کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے رفقائے کار میں لوئیس مانٹروس، لیزا جارڈائن، جوناڈن گولڈبرگ اور اسٹیفن اورگل شامل ہیں۔ یہ نو تاریخیت کا امریکی گروہ ہے۔ جبکہ مغرب میں نو تاریخیت کا آغاز مشل فوکو، مورس ڈکسٹین، میخائل باختن، لوئی آلتھیوسر نے

کیا۔ انھوں نے بھی اس نظریے کے ارتقا میں اپنا حصہ ڈالا۔ نو تاریخی ناقدین میں جوناتھن ڈولی مور کا نام اہم ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "Radical Tragedy" میں نو تاریخیت کی تعریف کی ہے کہ:

> "ابتدائی جدید انگریزی ڈرامے کے حقیقی عمل کو جدید قاری کے لیے انسان دوست تنقیدی رعایت نے مسخ کر دیا۔ جو کہ نظریاتی تنقید سے تعلق رکھتا ہے اور اس قسم کی نظریاتی تنقید نے سیاست اور طاقت کے رشتے اور انسان کی عدم مرکزیت کو موضوع بنایا۔"[4]

نو تاریخیت کے امریکی گروہ میں ایک اور نام جاناتھن گولڈ برگ کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم تاریخ کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کر سکتے اور نہ ہی تاریخ کو الگ ہو سکتے ہیں۔ تاریخ کا تعلق انسان کے ماضی کے حالات و واقعات سے ہوتا ہے۔ اور اس ماضی میں صرف تاریخی حقائق و واقعات ہی نہیں ہوتے بلکہ تہذیبی اور ثقافتی اطوار بھی شامل ہوتے ہیں۔ نو تاریخیت کے ضمن میں ڈیوڈسن نے کہا:

> "تاریخ ایک کیلکولیٹنگ مشین نہیں ہے۔ یہ ذہن اور تخیل کو کھولتی اور عوامی ثقافت کے ردِ عمل میں مجسم ہو جاتی ہے۔"[5]

فوکو کو اپنے نظریات کی مدد سے اپنے عہد میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ فوکو نے اپنے نظریے کو نظامِ فکر کی تاریخ" کے نام سے متعارف کروایا۔ کیوں کہ یہ ایک روائتی فلسفہ ہے۔ فوکو فرائیڈ اور مارکس کے نظریات سے کافی حد تک متاثر تھے۔ ایچ آرم ویسر نے نو تاریخیت کے ضمن میں بہت سے مضامین لکھے۔ ان کی ایک کتاب The New Historicism کے نام سے منظرِ عام پر آئی جو 1989 میں شائع ہوئی۔ انھوں نے اس اپنی کتاب میں تاریخ کو ہیئت پر فوقیت دی۔ اس حوالے سے انھوں نے لکھا:

> "ادبی تجزیے کے نتائج اخذ کرتے ہوئے نو تاریخیت اور ہیئت آپس میں متصادم بلکہ متضاد ہیں۔ کیوں کہ ہیئت پسندی تاریخ کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ نو تاریخیت کھوکھلی ہیئت پسندی کو جھنجھوڑتے ہوئے تاریخی عناصر کو ادبی تاریخ میں شامل کرتی ہے۔"[6]

ویسر کے خیال سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ کسی بھی ادب پارے کی تاریخ سے ہی اس ادب پارے کی روایت کی تشکیل ہوتی ہو جو بعد میں قاری کے سامنے آتی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے مزید کہا کہ: "تاریخی نقاد ثقافت کو بیان کرنے کے طریقوں کو تاریخ سے اخذ کرتے ہیں۔"[7]

ویسر نے اپنی کتاب میں تاریخ اور نو تاریخیت کے بارے میں بھی تفصیلاً بات کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "نو تاریخیت تاریخ کے مختلف ادوار میں مستحکم تخلیق کاری کا سراغ دیتی ہے اور زیادہ تو نشاۃ ثانیہ کے فنکاروں نے بنیادی موضوعات اور اس کے متعلقات کو تشکیل دیا۔"[8]

ویسر کی کتاب The New Historicism میں مختلف لوگوں کے مضامین اور کالم شامل ہیں۔ نوے کی دہائی میں نو تاریخیت سفر کرتی ہوئی اردو ادب میں داخل ہوئی۔ اردو میں سب سے پہلے نو تاریخیت کے حوالے سے لکھنے والوں میں ریاض صدیقی کا نام اہم ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین 1993 سے 1995 کے عرصے میں لکھے۔ نو تاریخیت کے حوالے سے ریاض صدیقی رقم طراز ہیں:

"نئی تاریخیت کا مؤقف یہ ہے کہ سماجی اور تاریخی تناظر میں ادب کا مطالعہ جاری رہ سکتا ہے۔ ادب محض ہوا میں تخلیق نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایک تاریخی حوالہ بھی ہے۔"[9]

نو تاریخیت کو مزید آسان کرتے ہوئے ریاض صدیقی اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے کہتے ہیں کہ:

> "تاریخ کے گزرے ہوئے دور کی اصل صورت سے ناواقفیت کا مسئلہ کم اہم نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم غلط روی کو صراطِ مستقیم سمجھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔۔۔۔ ریاستی اداروں جن میں علمی و تحقیقی ادارے بھی شامل ہیں اسی اقتدار و طاقت کے زیر سایہ کام کرتے ہیں۔ ان کا مجموعی کردار اصل واقعات کو مسخ کر کے ایسی تاریخ کو مسلط کرنا ہوتا ہے جو اہلِ اقتدار و اختیار کے نقطہ نظر کو تقویت فراہم کرے۔۔۔ تاریخ کے جلو میں اس کی اپنی چھپی ہوئی طاقت کا ایک دھارہ بھی ہوتا ہے جو ایک عہد ختم ہونے کے بعد خول توڑ کر باہر آجاتا ہے، اور ماضی کی ساری تاریخ کا جھوٹ سامنے آجاتا ہے۔"[10]

اس کے بعد کے لکھنے والوں میں شمس الرحمٰن فاروقی، ناصر عباس نیّر، گوپی چند نارنگ، پروفیسر عتیق اللہ اور الیاس بابر اعوان جیسے نام شامل ہیں۔ جنھوں نے اردو ادب میں نو تاریخیت کی مدد سے وہ راہیں ہموار کی جو ان سے پہلے کسی وجہ سے مخفی تھیں۔ اور جس سے ادب میں ایک نئی فکر پیدا ہوئی اور تاریخ میں واقعات کے علاوہ اس دور کا رہن سہن، معاشرت اور سب سے بڑھ کر ثقافت سے آگاہی ہوئی۔

ج۔ نو تاریخیت کیا ہے؟

بنیادی طور پر نو تاریخیت قرأت کا نام ہے۔ جس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادبی متون اپنے زمانے کے طور طریقوں اور رسم و رواج کو کس طرح سے ظاہر کرتے ہیں۔ نو تاریخیت میں قرأت کا ایک منفرد طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ اس میں متن کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کسی بھی ادب پارے کو بہترین طور پر کیسے پڑھا جاتا ہے۔ اور دیگر ہائے متون جیسے بشریات، اقتصادیات اور قانونی اور طبی دستاویزات کو سیاق وسباق کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یعنی اس میں صرف تاریخ یا واقعہ نہیں ہوتا بلکہ اس دور سے جڑی چھوٹی سے چھوٹی معمولی اور غیر معمولی چیز کے بارے میں بھی آگہی ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس میں ادبی اور غیر ادبی متون کو سامنے رکھ کر کسی بھی عہد کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ نو تاریخیت نہ تو ادب کو برتر رکھتی ہے اور نہ ہی تاریخ کو بلکہ یہ ادب اور تاریخ دونوں کو مساوی مقام دیتی ہے۔ ڈاکٹر الیاس بابر اعوان نے بھی ادبی اور غیر ادبی متون کو برابری کا درجہ دیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے کہا: نئی تاریخیت ادبی اور غیر ادبی متون کے مطالعے کا نام ہے، عام طور پر ان کا تعلق ایک ہی عہد سے ہوتا ہے۔[11]

ادب اپنے ماحول، رسم و رواج، اعتقادات اور طرز معاشرت کا ترجمان ہے۔ ہم جب کسی بھی عہد کے ادب پارے کو پڑھتے ہیں تو ہمارا واسطہ تاریخ سے بھی پڑتا ہے۔ کیوں کہ ہر عہد کا ایک مخصوص اندازِ فکر اور ذہنی رویہ ہوتا ہے۔ اس لیے نو تاریخیت یہ سوال اٹھاتی ہے کہ کسی ایک عہد کے ادب کا مطالعہ، دوسرے عہد میں بھی اسی طرح کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ کیوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذہنی رویے اور سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ اس لیے ادب اور تاریخ کے رشتے کو سمجھنے کے لیے ہمارے سامنے دو نظریات قابلِ غور ہیں۔ پہلا نظریہ جس میں ادبی مطالعے کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے سماجی اور تاریخی تناظرات کو سمجھنا ضروری ہے،

جبکہ دوسرے نظریے کے تحت ادب کا مطالعہ ادبی اصولوں سے ہی کرنا بہتر ہوتا ہے۔ لہذا کوئی بھی مصنف ادب کو تخلیق کرتے ہوئے تاریخی اور ثقافتی حقائق سے ادب پارے کو الگ نہیں کر سکتا۔ چناں چہ نو تاریخیت ادب کے خود مختار ہونے کے تصور کو رد کرتی ہے۔ نو تاریخیت میں صرف ادب اور ثقافت کا ہی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ثقافت کی تشکیل میں ادب کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ یعنی ادب تاریخ سے جنم لیتا ہے۔ جس کی مدد سے ثقافتی طور پر اس کی افزائش بھی ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گوئٹے کو جرمن کلچر کا، شیکسپیئر کو برطانوی اور غالب کو مغل کلچر کا ترجمان مانا جاتا ہے۔ نو تاریخی ناقدین نے کلچر کو سمجھنے کے لیے اس کی مثال اس کتاب کی سی دی ہے جس کو پڑھ کر ہم اپنے ماضی کے تمام تر حالات و واقعات سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ان معلومات سے ہم اس دور کے رہن سہن، رسم و رواج، معاشی و معاشرتی طور طریقوں اور عمومی رویوں کا جائزہ لیتے ہیں، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کلچر ہمیں متن کی صورت میں آسانی سے مل جاتا ہے۔ اس حوالے سے نو تاریخیت کی تعریف ویکیپیڈیا میں ہمیں ملتی ہے۔

"New Historicism, a form of literary theory which aims to understand intellectual history through its cultural context."[12]

ویبسٹر ڈکشنری میں نو تاریخیت کی تعریف کچھ اس طرح سے کی ہے:

> "A Method of literary Criticism that emphasizes the historicity of a text by relating it to the configurations of power , society, or ideology in a given time."[13]

ماضی میں رونما ہونے والے واقعات اور نو تاریخیت میں بہت فرق ہے۔ نو تاریخیت کے موضوع وسیع فکر، مکمل اور جامع تر ہے، جبکہ آخر الذکر کے لیے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ماضی کے نقادوں کو نو تاریخی ناقدین بھی کہنا کسی صورت بھی صحیح نہیں ہو گا کیوں کہ ان کے پاس صرف ماضی کی تاریخ کے سوا کچھ نہیں ہے اور وہ صرف ماضی کے واقعات کا شعور رکھتے ہیں۔ جبکہ نو تاریخیت کی بات کی جائے تو نو تاریخی ناقدین پرولتاریہ طبقے کو اہمیت دیتے ہیں اور اپنے مطالعے کی ابتدا بھی انھیں سے کرتے ہیں۔ نو تاریخی

ناقدین چھوٹے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو مساوی درجہ دیتے ہیں۔ ریاض صدیقی اس بارے میں کہتے ہیں کہ:

> "نو تاریخیت اپنے مطالعے کی ابتدا نچلی سطح سے کرتی ہے اور ان طبقات کو مساوی حیثیت دیتی ہے جن کو ایک زمانے تک ستر پردوں میں رکھا گیا تھا مثلاً محنت کش، کسان، غلام خواتین، جواں سال ناکے،--- سیاہ فام، تارکین وطن آباد کار اور اصل مقامی امریکی۔[14]

د۔ ثقافتی مادیت:

برطانیہ میں نو تاریخیت کو Cultural Materialism یعنی ثقافتی مادیت کہا جاتا ہے۔ ثقافتی مادیت کے حوالے سے لکھنے والوں میں ریمنڈ ولیمز، کیتھرین بلیسی، ایلن فیلڈ اور جوناتھن ڈولی مور جیسے معروف نام ہیں۔ جن کی تحریروں کی وجہ سے ثقافتی مادیت جیسی اصطلاح ہمارے سامنے آئی۔ یہ دراصل نو تاریخیت کی ذیلی شاخ ہے۔ تہذیبی مادیت کا فروغ اس وقت ہوا جب ہر طرف پس ساختیات کا چرچہ تھا۔ برطانوی گروہ کے ناقدین ادب اور تاریخ کو سیاست کے ساتھ جوڑتے ہیں ۔ گراہم ہولڈرینس نے کلچرل میٹرلزم کو Political Form of Historiography کا نام دیا، اسے آسان الفاظ میں سمجھنے کے لیے "تاریخ کی سیاسی تشکیل" بھی کہا جاسکتا ہے۔ یعنی ان کے ہاں متن کو سمجھنے کے لیے اس وقت کے سیاسی تناظرات کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر متن کے اندر کیا ہے؟ اس بات کا صحیح طور پر اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ Encyclopedia میں ثقافتی مادیت کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

> "Cultural Materialism A Macro- theory in anthropology which holds that most aspects of human culture can be explained in Material terms." [15]

کیتھرین بلیسی کے مطابق ادب اور تاریخ ہی صرف کافی نہیں ہے بلکہ انھوں نے ادب اور تاریخ کے ساتھ ساتھ سیاست کو بھی اہمیت دی اور ادب اور سیاست کو موضوع بنایا۔ ان کا ماننا ہے کہ ادب اور سیاست کو

کسی طور پر بھی الگ نہیں رکھ سکتے، مزید یہ کہ متن کے سیاسی تناظرات سے ہی اس کی تفہیم ممکن ہے۔ نو تاریخیت کے مقابلے میں تہذیبی مادیت کی اساس سیاست پر ہے۔ نو تاریخی نقاد کسی ادب پارے کو سمجھنے کے لیے تاریخی سیاق وسباق میں سیاست کو بھی شاملِ نظر رکھتے ہیں۔ متن کا صحیح طور پر تجزیہ کرنے کے لیے سیاسی وابستگیوں کو سمجھنا لازم ہے، کیوں کہ جو گزر جاتا ہے وہ ماضی کا حصہ بن جاتا ہے اور ماضی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف متن ہی واحد ذریعہ ہوتا ہے۔ ثقافتی مادیت کے ناقدین کا کہنا ہے کہ There is nothing outside the Text۔یعنی متن ہی سب کچھ ہوتا ہے اور متن سے ہٹ کر ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ تہذیبی مادیت ہی تاریخ کی سیاسی شکل ہے تو یہ کہنا کسی طور پر بھی غلط نہیں ہوگا۔ تہذیبی مادیت نے پہلے سے چلے آئے روائتی تصور کو اہمیت دینے کی بجائے، اس نئے تصور کو معنی دیے جس کا دراصل ہماری تہذیب سے گہرا تعلق ہے۔ جان برنیگن اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "Cultural materialism intended to explore literary text within the context of contemporary power relations."[16]

ریمنڈ ولیمز نے ثقافت کو تین عناصر میں تقسیم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ثقافت حاوی، باقیاتی اور نو خیز کا مرکب ہے۔ ریمنڈ ولیمز نے انگریزی میں اس کے لیے Dominant , Residual اور Emergent کی اصطلاحات متعارف کروائی ہیں۔ انھوں نے ان تینوں حاوی، باقیاتی اور نو خیز کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا ہے، حکمران طبقے کا تعلق حاوی (Dominant) کلچر سے جڑا ہوا ہے یعنی یہ کلچر بورژوا طبقے کی پیداوار ہے۔ اس لیے حکمران طبقے کے بدلنے کے اثرات ڈومیننٹ کلچر پر بھی پڑتے ہیں۔ جبکہ باقیاتی کلچر کسی سہارے کے بغیر اپنے بل بوتے پر پروان چڑھتا ہے۔ ذاتی مفادات کے تحت خود کار باقیاتی Residual کلچر کو پسِ پشت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان میں نو خیز (Emergent) کلچر نئے طبقے کی مرحونِ منت سمجھا جاتا ہے۔ ریمنڈ ولیمز اس حوالے سے اپنی ایک کتاب میں کہتے ہیں کہ:

> حاوی کلچر وہ ہے جس کی تعریف اور حدود کو حکمران جماعت متعین کرتی ہے جبکہ باقیاتی کلچر سے مراد وہ اقدار، معانی، تجربات اور اعمال ہیں جن کی تشکیل ماضی میں ہوئی، مگر جو

زمانہ حال میں بھی افعال طور پر موجود ہیں۔ نو خیز کلچر سے مراد وہ نئے معانی، نئی اقدار، نئے اعمال، نئے رشتے اور رشتوں کی نئی اقسام ہیں جو برابر تحقیق ہو رہی ہوتی ہے۔[17]

ثقافتی مادیت کی ہی بدولت ادبی متون کے ان عناصر پر روشنی ڈالی جاتی ہے جو استحصالی کا شکار ہو کر ادب کا حصہ نہیں رہتے اور ماضی میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ ثقافتی مادیت ان کا مطالعہ ماضی کے حال کی طرح کرتا ہے۔ یہ سماج کی ان حقیقتوں کو واضح کر کے سماج کی سیاست کو بے نقاب کرتا ہے۔ جسے ماضی میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

ج۔ مصنفین کا اجمالی تعارف:

اردو ادب میں خواتین کے لکھنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ برصغیر میں شعر و ادب پر مردوں کا اختیار تھا۔ اگر کوئی خاتون لکھنے کی خواہش مند ہوتی تو اس کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا۔ اس وقت کی خواتین ادیبائیں جو تعداد میں نہ ہونے کے برابر ہی تھیں انھوں نے اپنے ناموں کا پردہ رکھا ہوا تھا یا فرضی ناموں سے اپنی تصانیف شائع کرواتی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں خواتین نے ناول نگاری کی ابتدا کی، بیسویں صدی کے آغاز میں ہی بہت سے ناول جو خواتین نے اپنے ناموں سے لکھے وہ منظر عام پر آگئے تھے۔ آہستہ آہستہ معاشرے میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ نئی تعلیم اور سیاسی تحاریک کی بدولت عورت کو بھی وہ حق ملا جو اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ خواتین ادیباؤں نے اردو ادب کو بیش بہا خزانے سے بھر دیا۔ ایسے میں علم و ادب سے تعلق رکھنے والی دو خواتین ناول نگار جنھوں نے نہ صرف ناول نگاری کی، بلکہ بہت سے افسانے بھی لکھے جو مقبولِ عام ہوئے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ دو خواتین ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بہنیں بھی ہیں۔

1۔ الطاف فاطمہ کی سوانح اور ادبی خدمات:

الف۔ حالاتِ زندگی اور سوانح

برصغیر سے تعلق رکھنے والی ادیبہ، ناول نگار، مترجم، تنقید نگار، افسانہ نگار مصنفہ الطاف فاطمہ 10 جون 1927 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ الطاف فاطمہ کا تعلق علم و ادب سے تعلق رکھنے والے گھرانے سے

تھا۔ ہندوستان میں ان کے گھرانے کو "سلسلہ علما" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت عمر ؓ فاروق خلیفہ دوم سے جاملتا ہے۔ لکھنؤ میں ان کا تعلق یو۔پی کے مشہور قصبے خیر آباد سے تھا۔ قصبہ خیر آباد علم و دانش کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتا تھا۔ فضل امام خیر آبادی ان کے جدِ اعلیٰ تھے۔ مولانا صاحب اہل تصنیف تھے اور ساتھ ہی ساتھ فقہ کا علم بھی رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں الطاف فاطمہ خود رقم طراز ہیں:

> ان کی تصانیف آج تک جامع اظہر (معر) کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس خاندان کے علما کے فتویٰ کے بغیر مدینہ اور مکہ کے علما بھی فتویٰ کو مستند قرار نہیں دیتے تھے۔[18]

الطاف فاطمہ کے والد محمد فضل امین اور والدہ سیدہ ممتاز جہاں بیگم تھیں۔ ان کے والد محمد فضل امین علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ یہاں سے انھوں نے ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔ فضل امین کا شروع سے ہی مذہبی علوم کی طرف رجحان تھا۔ حسرت موہانی کے رسالے میں فرضی ناموں سے مضمون بھی لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ فارسی اور انگریزی ادب میں بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ الطاف فاطمہ کے بقول انگریزی اور فارسی زبان اس قدر شائستہ انداز میں بولتے تھے کہ ایل زبان معلوم ہوتے تھے۔ دورانِ تعلیم سٹوڈنٹ یونین کے صدر بھی رہے اور انگریزوں کے خلاف تقریروں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی وفات کم عمری میں ہوئی اور 33 سال کی عمر میں دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا اس وقت الطاف فاطمہ کم سن تھیں۔ اس حوالے سے وہ کہتی ہیں کہ ان کی وفات کے وقت ہم بہت کم سن تھے۔ میری بہن کی ولادت تو ان کی وفات کے چار ماہ بعد ہوئی۔

اپنے والد کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ:

> ایک بے حد خوش شکل، وجیہہ اور اعلیٰ قسم کا لباس پہنے ہوئے ایک شخصیت کا تصور آج بھی دل میں سمایا ہوا ہے۔ شاید بہت کم دیکھا اور واسطہ رہا۔ اس لیے ایک متاعِ عزیز کی طرح آب دار موتی کی یاد ہے، جو رہ رہ کر ذہن کے پردے پر دمکتی ہے۔[19]

ان کے والد وفات سے پہلے اسسٹنٹ چیف سیکرٹری تھے۔ جبکہ والدہ سیدہ ممتاز جہاں بیگم بھی تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اتنی کم عمری میں بیوہ ہونے کے باوجود انھوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ حوصلے سے زندگی کی

گاڑی کو چلایا اور اپنے بچوں کو ہر قسم کی محرومی سے دور رکھنے کے لیے ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کیا۔ ان کو کثرت مطالعہ کا شوق تھا۔ وہ اس سے جڑی معلومات اپنے بچوں کو بھی دیتی رہتی تھیں، تاکہ سیاسی اور سماجی طور پر ان کے بچوں میں معاشرتی شعور پیدا ہو سکے۔ نومبر 1964 کو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

الطاف فاطمہ نے ابتدائی تعلیم گھر میں ہی ماموں زاد بھائی محمود حامد سے انگریزی میں شروع کی۔ والدہ سیدہ ممتاز جہاں چوں کہ پڑھی لکھی خاتون تھیں اس لیے انھوں نے الطاف فاطمہ کو اردو لکھنی اور پڑھنی سکھائی۔ علم و ادب کے گھرانے سے تعلق ہونے کی وجہ سے بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ محمود حامد کے فارسی کے استاد جو درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے۔ الطاف فاطمہ کے پڑھائی کے شوق کو دیکھتے ہوئے ان کو خود فارسی پڑھانا شروع کی۔ یہی وجہ تھی کہ الطاف فاطمہ کو اس وقت کے علوم اور ادب سے گہری رغبت ہو گئی۔ الطاف فاطمہ حافظ شیخ سعدی شیر ازی کی حکایتوں کو بہت پسند کرتی تھیں اور ان کی حکایتوں کی ہی بدولت ان پر بچپن سے ہی صوفیانہ رنگ غالب آ گیا۔ وہ خود کہتی ہیں کہ:

> شیخ سعدی کے افکار، فلسفہ زیست اور سماجی شعور کا میرے مزاج، فکر اور رویوں میں شروع ہی سے ایک کردار رہا ہے۔ نہ جانے کیوں چھوٹی چھوٹی اور سیدھے سادے انداز میں لکھی حکایتوں نے میرے دل میں دنیا کی وقعت کم کر دی۔[20]

باقاعدہ طور پر تعلیمی زندگی کا آغاز چرچ مشن سکول جاورہ سے کیا۔ الطاف فاطمہ اپنے بھائی فضل قدیر سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ اس دونوں نے ابتدائی تعلیم ایک ہی سکول سے حاصل کی۔ ان کے بھائی فضل قدیر کا داخلہ بعد میں امریکن سکول میں کروادیا گیا جس کا الطاف فاطمہ پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ہمہ وقت بھائی کو یاد کرتی تھیں اور اداس ہو جاتی کیوں کہ ان کو عادت تھی کہ وہ جو کچھ بھی پڑھتی تھیں اپنے بھائی کو ساتھ ضرور سناتی تھی، لیکن بھائی کے جانے کے بعد مطالعے کے وقت ان کو اپنے بھائی کی بہت یاد آتی۔ الطاف فاطمہ کو شروع میں پڑھنے لکھنے کا کچھ خاص شوق نہیں تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا جھکاؤ مطالعے کی طرف ہو گیا۔ وہ کم گو تھیں اور اپنا تمام وقت کتابیں پڑھنے میں گزار دیتی تھیں۔ کثرتِ مطالعے سے ان کے

مزاج میں سنجیدگی آگئی اور مطالعہ ان کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ اس بارے میں انتظار حسین کہتے ہیں کہ: یہ لڑکی اچھلتی کودتی تو تھی مگر بولتی نہیں تھی۔ ہمیشہ چپ رہتی جیسے منھ میں زبان ہی نہ ہو۔ ہڑونگی مگر گونگی۔"[21]

الطاف فاطمہ کو اخبار پڑھنا پسند نہیں تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ اخبار پڑھنے سے سیاسی معاملات ہمہ وقت ذہن نشیں رہتے ہیں سیاسی غور بڑھ جانے کی وجہ سے سیاسی معاملات پر بات کرنے کا دل کرتا ہے، لیکن اس وجہ سے سارا دھیان سیاست کی طرف رہتا ہے اور پھر افسانے یا ناول لکھنے کا جی نہیں چاہتا۔ ان کا گھریلو ماحول ہی ایسا تھا جس میں خواتین مطالعہ ذوق وشوق سے کرتی تھیں اس لیے وہ اپنے افسانے کے حوالے سے کہتی ہیں کہ جب میں اورینٹل کالج میں ایم اے کر رہی تھی اس وقت میں نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔

الطاف فاطمہ نے سب سے پہلے سکول میں ملازمت کی اس کے بعد لیکچرار کی حیثیت سے اسلامیہ کالج میں پڑھانے کا آغاز کیا۔ ساری زندگی درس و تدریس سے وابسطہ رہیں۔ ماہ پارہ صفدر کے انٹرویو میں جب ان سے پوچھا گیا کہ آیا وہ اچھی ناول نگار ہیں یا اچھی افسانہ نگار تو انھوں نے جواب میں کہا کہ میں نہ تو اچھی ناول نگار ہوں نہ افسانہ نگار بلکہ میں تو صرف استاد ہوں۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ خود بھی لکھنے کا کام جاری رکھا اور اردو ادب کے لیے بہت سے مقبول افسانے اور ناول تحریر کیے۔ انھوں نے ہر قسم کے موضوع پر افسانے اور ناول لکھے۔ رؤف ظفر نے اپنے ایک کالم میں لکھا ہے کہ:

> زمانہ طالب علمی میں ہی الطاف فاطمہ کا زرخیز قلم رواں دواں ہو گیا تھا۔ انھیں ترجمہ کرنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس کے علاوہ نشانِ محفل، دستک نہ دو، چلتا مسافر، خواب نگر اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ دستک نہ دو کو ڈرامہ کی شکل میں ٹی وی پر بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ [22]

1962 میں الطاف فاطمہ نے اپنا پہلا افسانہ لکھا۔ جو لاہور کے معروف ادبی رسالے "ادب لطیف" میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کو ہمیشہ مقبولیت ملی اور ملک کے معروف رسائل میں شائع کیے جاتے تھے۔ ان کو جانور بہت پسند تھے۔ حتیٰ کہ انھوں نے مختلف جانور بھی گھر میں پال رکھے تھے مثلاً بگلے، طوطے، خرگوش وغیرہ۔ انھیں ماہر حیوانات بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ ان کو جانوروں کی عادات کا بھی اچھے سے معلوم ہوتا

تھا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں بھی جانوروں کو شامل رکھا اور ان پر افسانے تحریر کیے۔ انتظار حسین کہتے ہیں کہ:

> اس نے جانوروں کے افسانے لکھے۔ بھانجی نے گائے بھینسوں پر ایک معلوماتی کتاب لکھ ڈالی۔ رفیق حسین کی روایت کو الطاف فاطمہ نے کیا خوب نبھایا ہے۔ خیر یہ ضمنی کاروائی تھی۔۔۔۔ باقی یہ کہ جانوروں سے انھیں دلچسپی تو رہی ہے اور ایک زمانے تک وہ خود اسی زمرے میں شمار ہوتی تھیں ۔ سب گھر والے انھیں گھوڑی کہتے تھے۔ الطاف فاطمہ گھوڑی۔[23]

بحثیت افسانہ نگار الطاف فاطمہ کا ایک خاص مقام ہے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی انھوں نے افسانے لکھنے کا آغاز کر دیا۔ ان کے افسانوں کی خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے روائتی طرز سے ہٹ کر افسانے تحریر کیے۔ جن کے موضوعات معاشرتی مسائل تھے۔ الطاف فاطمہ کے افسانوی مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

ب۔ الطاف فاطمہ کی ادبی خدمات:

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "وہ جسے چاہا گیا" ہے جو 1969 میں شائع ہوا۔ اس میں 21 افسانے شامل ہیں۔ ان کے افسانے پہلی مرتبہ اردو ڈائجسٹ سے نکلتے تھے۔ ان افسانوں کا موضوع 1965 کی جنگ ہے اور اس وقت کے ساز گار حالات و واقعات کو انھوں نے اپنے افسانوں میں تحریر کیا، جس کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

الطاف فاطمہ کا دوسرا افسانوں کا مجموعہ "جب دیواریں گریہ کرتی ہیں" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ پہلی بار 1988 میں شائع ہوا۔ اس میں 10 افسانے شامل ہیں۔ قصور آرٹ پریس لاہور نے اس افسانوی مجموعے کو پہلی بار شائع کیا۔

"تار عنکبوت" ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ جسے فیروز اینڈ سنز نے 1990 میں شائع کیا۔ اس میں 41 افسانے شامل ہیں۔

"دریدو ادید" ان کا معروف افسانوی مجموعہ ہے۔ جو 2017 میں شائع ہوا۔ جمہوری پبلشر لاہور سے یہ مجموعہ شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعے کی خاصیت یہ ہے کہ کراچی لٹریچر فیسٹیول کی طرف سے یہ کتاب انعام یافتہ ہے۔

ان کا آخری افسانوی مجموعہ "گواہی آخری شب کی" جمہوری پبلشر لاہور سے 2018 میں شائع ہونے والی کتاب ہے۔

الطاف فاطمہ نے افسانوں کے ساتھ ساتھ تراجم بھی لکھے جن کو بہت مقبولیت ملی۔ اس کے علاوہ تنقید نگاری پر بھی ان کا بہت زیادہ کام ہے۔ لیکن الطاف فاطمہ کی وجہ شہرت ان کے ناول ہیں۔ ان کے ناولوں میں حب الوطنی اور مذہب کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ الطاف فاطمہ کا اسلوب نگارش دوسرے ناول نگاروں سے مختلف تھا۔ یہ انفرادیت ان کے کرداروں میں واضح نظر آتی ہے خصوصاً نسوانی کرداروں میں یہ خوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ عورت کی فطرت میں باریک بینی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتی ہے اور اسے آنے والے واقعات کی بھانپ پہلے ہی ہو جاتی ہے۔ الطاف فاطمہ کے ہر ناول کی ہیروئن میں یہ خوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مضبوط قوتِ ارادہ کی مالک ہیروئن پورے ناول پر چھائی ہوئی نظر آتی ہیں۔

الطاف فاطمہ کا پہلا ناول "نشانِ محفل" ہے جو مکتبہ دانیال لاہور نے 1975 میں شائع کیا۔ یہ ایک ضخیم ناول ہے جو تقریباً سات سو صفحات میں سامنے آیا۔ یہ ایک المیہ رومانوی کہانی ہے جس میں مشرقی عورت اور مغربی عورت کے طرزِ معاشرت، طرزِ فکر اور ان کے درمیان ہر طرح کے فرق کے بارے میں لکھا ہوا ہے۔

الطاف فاطمہ کا دوسرا ناول "دستک نہ دو" 1966 میں سامنے آیا۔ اس ناول میں تقسیمِ ہند سے چند سال قبل کے حالات و واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اس میں اس ہندوستان کی کہانی ہے جو متحد تھا اور ہندو و مسلم ایک ساتھ مل کر رہتے تھے۔ علاوہ ازیں اس ناول میں تقسیمِ ہند کے دوران ہونے والے دلخراش واقعات اور ان کی مناظرات کی تصویر کشی الطاف فاطمہ نے کی ہے جس میں مسلمانوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے گئے

اور ان کو اعتاب کا نشانہ بنا دکھایا گیا۔ الطاف فاطمہ نے فسادات کے ان وقوعوں کو بھی ناول میں شاملِ تحریر کیا جس سے ہندو، مسلم، سکھ سب مختلف نوعیت سے متاثر ہوئے۔ ان کے ناول کے نسوانی کردار نہایت بھرپور اعصاب کے حامل ہیں۔ اس کی مثال ناول کا ایک کردار جو چھوٹی بچی ہے۔ جس کا نام گیتی ہے۔ جس کی دوستی ایک چینی مسلمان سے ہوتی ہے جو گلی گلی جا کر گھریلو ضرورت کا سامان بیچتا ہے۔ ایک بار گیتی دیوار سے گر جاتی ہے اور ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے تو یہی چینی اس کی مدد کرتا ہے اور گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ اس چینی کا نام "لیوچو" ہوتا ہے جبکہ اسلامی نام "صفدر یاسین" ہوتا ہے۔ وہ روز گیتی کی خیریت لینے گھر آتا ہے۔ جس پر گیتی کے گھر والے اس کو منع کرتے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود گیتی اس سے ملاقات کرتی رہتی ہے۔ اس اجنبی چینی کو چھوٹی بچی سے انسیت ہو جاتی ہے۔ گیتی بڑی ہو جاتی ہے اور اپنے ایک رشتے دار سے محبت ہو جاتی ہے اور اظہارِ محبت کر بیٹھتی ہے۔ اس کے گھر والوں کو جب اس بات کی خبر ہوتی ہے تو گیتی بغیر جھجکے اس بات کا اعتراف کرتی ہے اور ایک دن گھر چھوڑ دیتی ہے۔ الطاف فاطمہ نے اس ناول میں ایک لڑکی کے احساسات و جذبات کو المیہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس ناول کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں نسوانی نفسیات کی منظر کشی نہایت عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔ اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے۔ The one who did not ask کے نام اس کا ترجمہ منظرِ عام پر آیا۔

ان کا تیسرا ناول "چلتا مسافر" کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ جو 1980 میں فیروز سنز، لاہور نے اس کا پہلا ایڈیشن نکالا۔ اس ناول کی خاصیت یہ ہے کہ الطاف فاطمہ نے یہ ناول دس سال کے عرصے میں مکمل کیا۔ اس ناول کا پسِ منظر مشرقی پاکستان کے المیے کی داستان ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کو اس سے پہلے کسی نے بھی ایسے منفرد تناظر میں نہیں لکھا۔

ان کا آخری ناول 2008 میں "خواب گر" کے نام سے فیروز اینڈ سنز نے شائع کیا۔ خواب گر الطاف فاطمہ کے دیگر ناولوں سے یکسر مختلف ناول ہے۔ اس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ناول کم اور سفر نامہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ سفر نامہ نہیں خالصتاً ناول ہے۔ الطاف فاطمہ نے اس ناول میں اسکردو اور بلتستان میں رہنے والے سادہ لوح لوگوں کی کہانی کو بیان کیا ہے، جو رزق کی تلاش میں لاہور جیسے تیز ترین شہر میں آ کر بھٹکتے پھرتے ہیں اور سال سال بھر گھر اور گھر والوں سے دور رہ کر اس تیز ترین دنیا کے مقابل چلنے کی

دوڑ میں لگے رہتے ہیں، تاکہ وہ اپنے خوابوں کو پورا کر سکیں۔ اپنے خوابوں کی تکمیل میں ان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ سب الطاف فاطمہ نے اپنے ناول "خواب گر" میں سپردِ قلم کیا۔

ج۔ وفات:

ہجرت کے بعد الطاف فاطمہ لاہور منتقل ہو گئیں اور ساری زندگی لاہور رہ کر گزاری۔ زندگی کے آخری دنوں میں الطاف فاطمہ بہت بیمار ہو گئی، ان کی آنکھوں کی بینائی بھی چلی گئی۔ لیکن علاج کے بعد ان کی بینائی واپس آ گئی۔ الطاف فاطمہ کے بھانجے یعنی نشاط فاطمہ کے بیٹے نے ان کی بہت خدمت کی لیکن مسلسل علالت کی وجہ سے الطاف فاطمہ 29 نومبر 2018 کو لاہور میں وفات پا گئیں۔

2۔ نشاط فاطمہ کی سوانح اور ادبی خدمات:

الطاف فاطمہ کی طرح ان کی بہن نشاط فاطمہ نے بھی ناول نگاری میں اپنا منفرد نام بنایا اور اردو ادب میں اپنی تحاریر سے خود کو متعارف کروایا۔ نشاط فاطمہ کا اردو ادب میں بہت بڑا نام ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں مافوق الفطرت واقعات کا بیان نہیں کیا بلکہ معاشرے کی تلخی اور فرسودہ خیالات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

الف۔ حالاتِ زندگی اور سوانح:

نشاط فاطمہ کا شمار پاکستانی ادب کے نمایاں ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بطور ناول نگار اور افسانہ نگار ادیبہ کے طور پر نام بنایا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر جس طرح نشاط فاطمہ نے دل جمعی سے لکھا ہے اس کی مثال کسی اور ادیب کے ہاں کم ہی نظر آئی ہے۔ پاکستانی ادب میں تانیثی شعور کو تخلیقی اظہار کا حصہ بنانے کے سبب ان کی اہمیت اور انفرادیت مسلمہ ہے۔ بطور فکشن نگار ان کا شمار اہم خواتین تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔

نشاط فاطمہ 22 دسمبر 1933 کو لکھنو میں پیدا ہوئیں۔ نشاط فاطمہ چوں کہ اپنے والد کی وفات کے چار ماہ بعد پیدا ہوئیں لہذا انھیں باقی بچوں کی نسبت زیادہ پیار ملا۔ اور ان کا نام نشاط فاطمہ رکھا گیا۔ اس نام کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہی ہے کہ یہ بچی (نشاط فاطمہ) ایسے گھر میں پیدا ہوئیں جہاں اُس بچے کی پیدائش، جو والد کی وفات کے بعد پیدا ہو اس کو خیر اور برکت والا مانا جاتا تھا۔ کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کی پیدائش بھی والد

کی وفات کے بعد ہوئی تھی، لہذا وہ ایسی پیدائش کو سنتِ رسول ﷺ مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فطرتاً ایسے بچے کو زیادہ پیار ملتا ہے۔ لیکن نشاط فاطمہ کو خاندان میں سب سے زیادہ پیار ان کے نانا سید جعفر حسین سے ملا۔ الطاف فاطمہ کہتی ہیں کہ نشو کو لڈو بہت پسند تھے۔ ان کے نانا جب بھی گھر آتے تو نشو کے لیے لڈو ضرور لاتے تھے، اگر کبھی وہ بھول جاتے تو دروازے سے ہی واپس پلٹ جاتے تھے اور کہتے کہ لڈو لانا یاد نہیں رہا وہی لانے جارہا ہوں۔ الطاف فاطمہ کے بقول کہ ان کے نانا نے ان سب بچوں کو کبھی بھی والد کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ وہ ہمیشہ ان کو گھمانے کبھی میوزیم، پارک، سکندر باغ اور لکھنو کے چڑیا گھر لے کر جایا کرتے تھے۔ نشاط فاطمہ ہمیشہ اپنے نانا کے ساتھ سوتی تھی، سونے سے پہلے ہمیشہ کہانی سنتی تھیں۔ ایک کے بعد دوسری کہانی چلتی تھی۔ جعفر حسین نانا ان کو ہمیشہ جانوروں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے بھتیجے نے کہا کہ ہمیں تو کبھی کہانی نہیں سنائی تو انھوں نے بہت آہستہ آواز میں کہا "جب میں نہیں ہوں گا تو کون نشو کو بہلایا کرے گا"۔[24]

نشاط فاطمہ شروع سے ہی حساس طبعیت کی مالک تھیں۔ ان کا رنگ سفید تھا۔ ان کے سنہری رنگ کے گھنگریالے بال تھا۔ الطاف فاطمہ اپنی بہن کے بارے میں کہتی ہیں کہ: "ایک تو رنگ روپ اوپر سے نرم ریشم سے سنہری بالوں کا گھونگر ایسا جیسے کسی نے کرلر لگا کر بنائے ہوں"[25]۔

نشاط فاطمہ کی والدہ انھیں طرح طرح کی خوبصورت فراکیں پہنایا کرتی تھیں۔ نشاط دیگر بہن بھائیوں سے مختلف اور قدرے خوبصورت تھیں۔ ان کے بالوں کے بارے میں کئی لوگ ان کو کہتے تھے کہ یہ بال کہاں سے بنوائے ہیں تو وہ جواب میں کہتی کہ اللہ میاں نے فرشتوں سے آرڈر پر تیار کروائے ہیں۔ وہ بچپن سے ہی حاضر جواب اور ذہین بچی تھیں۔

نشاط فاطمہ کی والدہ سیدہ ممتاز جہاں بیگم شگفتہ مزاج کی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنے بچوں کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آتی تھیں۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ بھی تھی کہ ان کے بچے بہت چھوٹی عمر میں ہی والد کی محبت سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ نے ماسٹر صاحب کو بھی یہ کہ رکھا تھا کہ ان کے بچے بہت حساس ہیں، اس لیے ان کو ڈانٹنے کی بجائے انھیں نرمی سے پڑھائیں۔ اور دوسری طرف اپنے بچوں کو یہ کہتی

تھیں کہ اگر استاد سے ان کی کوئی شکایت آئی تو ان کو شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ نشاط فاطمہ کی ابتدائی تعلیم ان کی والدہ نے خود گھر میں ہی دی۔ جو استاد ان کے باقی بچوں کو پڑھانے آتے تھے۔ وہ نشاط فاطمہ کے ساتھ بہت کھیلتے تھے۔ ان کی والدہ نے نشاط کو بھی اسی استاد کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجا۔ تو ایک دن پڑھنے کے دوران استاد نے کسی غلطی پر نشاط کو ڈانٹا تو انھوں نے استاد کے منھ پر سلیٹ مار دی، اور والدہ نے بھی اُلٹا استاد صاحب کو ہی ڈانٹا کہ انھوں نے ہی اس کو بگاڑا ہے۔ اسی وجہ سے نشاط نے یہ حرکت کی ہے۔ اس کے بعد ممتاز بیگم نے نشاط فاطمہ کو خود ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد نشاط کو مسلم اسکول جس کا نام "تعلیم گاہ" تھا اس میں ان کا نام لکھوا یا دیا۔ نشاط فاطمہ پڑھائی میں بہت ہوشیار طالب علم تھیں۔ ان کے ماسٹر صاحب بہت ہی ہنس مکھ طبعیت کے تھے اور بچوں کو کلاس کے دوران بھی مختلف قسم کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ لیکن جب پڑھائی کی بات آتی تو وہ بہت سنجیدہ ہو جاتے تھے کہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ یہ وہی انسان ہے۔ کسی سے ایک غلطی ہو جاتی تو وہ سو بار وہ غلطی لکھواتے تھے۔ اگر نشاط فاطمہ کی کبھی غلطی نکلتی تو وہ سو کی بجائے صرف دس مرتبہ ہی لکھ کر جمع کروا دیتی۔ استاد کے پوچھنے پر کہتی تھیں کہ سو بار لکھنے سے ہاتھ دُکھتا ہے اور دس مرتبہ لکھنے سے بھی یاد ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں میٹرک کے امتحان پاس کرنے کے لیے عمر کی پابندی نہیں ہوتی تھی اور دوسری طرف پورے ملک میں آزادی کی تحاریک چل رہی تھیں۔ چناں چہ نشاط فاطمہ کی والدہ نے ان کی میٹرک کی تیاری پرائیوٹ طور پر کروائی۔ اس طرح تیرہ سال کی عمر میں نشاط فاطمہ نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ میٹرک کے بعد کالج کی زندگی کا آغاز ہوا تو انھوں نے میلاو دیلا کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس کالج میں ہندی کا مضمون لازمی تھا۔ چناں چہ ان کی والدہ نے ایک پنڈت جی کو مقرر کیا جو نشاط کو ہندی پڑھایا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نشاط فاطمہ اتنی ذہن ہیں کہ کچھ وقت بعد وہ ان کو سنسکرت بھی پڑھائیں گے۔ اسی دوران ہی انھیں ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔ جس سے وقتی طور پر ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ لیکن ان کی والدہ کو بہت شوق تھا کہ ان کے بچے تعلیم حاصل کریں۔ اس لیے یہاں آتے سب سے پہلا کام ہی یہی کیا۔ اس طرح نشاط فاطمہ کا داخلہ اسلامیہ کالج میں کروایا دیا گیا۔ سیکنڈ ائیر کے امتحان پاس کرنے کے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ نشاط فاطمہ کی شادی ان کے خاندان میں ہی ان کی خالہ اشتیاق جہاں کے بیٹے انیس عمر سے طے پائی۔ ان کے سسر ظفر عمر کا نام بھی اردو ادب کے نامور ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ نیلی چھتری کے مصنف نشاط

فاطمہ کے خالو تھے۔ ظفر عمر صاحب نے علی گڑھ میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزاری اور پاکستان آنے کے بعد ایک کنسٹرکشن کمپنی "عمر اینڈ سنز" کے نام سے بنائی۔ عمر اینڈ سنز کنسٹرکشن کمپنی کے پہلے پراجیکٹ کا نام "رسول پروجیکٹ" رکھا گیا۔ اس وقت ہندوستان سے بجلی لی جارہی تھی اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ ہندوستان بجلی کی فراہمی ختم کرکے معاہدے کو توڑ دے گا، لیکن عمر اینڈ سنز کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا کہ وقت سے پہلے یہ پراجیکٹ پورا کرلیا گیا۔ اب اگلا کام مشرقی پاکستان (بنگلہدیش) میں تھا، چناں چہ انیس عمر اپنی زوجہ نشاط فاطمہ کے ہمراہ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ انیس عمر اور ان کے دو بھائیوں نے وہاں پر کام کرنا شروع کیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بجلی کا تو ذکر ہی کیا، مٹی کا تیل بھی نہیں ملتا تھا۔ دوسری طرف بنگالیوں کے حالاتِ زندگی نے نشاط فاطمہ کے حساس دل پر گہرا اثر کیا۔ مشرقی پاکستان میں رہ کر انھوں نے بنگالیوں کی زندگی کا الگ ہی روپ دیکھا اور انھوں نے ان لوگوں کی مشکلات اور پریشان حال زندگی کو قریب سے دیکھا اور بذاتِ خود اس کو بھی اکثر ان کلفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نشاط فاطمہ خود کہا کرتی تھیں:

> یہاں سے جانے والے بیوروکریٹس اپنے اختیار اور اقتدار کے نشہ میں ان کے اندر خاموش باغیانہ جذبے پیدا کررہے ہیں حالانکہ یہ ایسی بدنصیب اور دکھ درد سے معمور سرزمین ہے کہ انسان محسوس کرے تو اس کو کھاتے پیتے بھی شرم آئے۔ [26]

غربت، افلاس اور مختلف بیماریوں کا مشاہدہ کرنے اور سقوطِ ڈھاکہ جیسے ہولناک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد انھوں نے قلم اُٹھایا اور کچی عمر میں ایسے دل دہلا دینے والے واقعات سے معمور اپنے احساسات اور مشاہدات کو صفحہ کے قرطاس پر لکھنا شروع کردیا۔ اس طرح سے نشاط فاطمہ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔

ب۔ نشاط فاطمہ کی ادبی خدمات:

نشاط فاطمہ نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے دردناک حقائق کو بیان کیا ہے۔ تقسیمِ ہند، ہجرت کے واقعات و فسادات، پاک بھارت کشیدگی اور اس کے بعد 1971 کی جنگ کو نشاط نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس کی مثال "انسان کی تلاش"، "وقت کی صلیب" اور "گم کردہ راہِ منزل" میں ہمیں نظر آتی

ہے۔ ان افسانوں میں قیامِ پاکستان کے تکلیف دہ واقعات کو انھوں نے قلم بند کیا۔ جبکہ "انسان کی تلاش" اور "چاند ڈوب گیا" میں انھوں نے مشرقی پاکستان کے ساتھ کی گئی زیادتیوں اور دل خراش حادثات کو زیرِ قلم کیا جو اس وقت کے بنگالیوں نے صبر وضبط سے برداشت کیے۔ ہجرت اور فسادات نے انسان کو ذہنی طور پر نفسیاتی بنا دیا۔ اس کا اثر نہ صرف بڑوں، بوڑھوں پر ہوا بلکہ بچے بھی اس تناؤ کا شکار رہے۔ جبکہ مشرقی پاکستان والے غربت اور افلاس کے ساتھ ساتھ مختلف بیماریوں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ نشاط فاطمہ نے سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں افراد کو درپیش مسائل اور طرزِ زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کی حساس طبیعت کی وجہ سے ان کے افسانوں میں ایک منفرد طرزِ تحریر نظر آتا ہے۔ جس کا انھوں نے باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد زیرِ تحریر کیا۔ ان کے بیشتر افسانے تو ایسے ہیں جس میں سقوطِ ڈھاکہ کی عملی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے ان افسانوں میں انسانی حقائق اور ان کا مطمعِ نظر بیان کیا۔ اگر نشاط فاطمہ کے افسانوں کا جائزہ لیں تو یاسیت اور مایوسی کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے جس دور میں لکھنے کا آغاز کیا، اس دور میں تاریخی اور سیاسی واقعات بہت زیادہ رونما ہوئے۔ ہر طرف مایوسی کی اس کیفیت نے نشاط کے حساس ذہن پر بھی اثرات ڈالے، جو ان کے گہرے اثری شعور اور وسعت کا پتہ دیتا ہے۔ جو انہیں کا خاصہ ہے۔ جس نے ان کے فکر و فن کو اعلیٰ معراج تک پہنچایا۔ ڈاکٹر نازیہ یونس نے اس حوالے سے کہا ہے

> نشاط فاطمہ نے اس دور کے معاشرے کی تصویر کشی کی ہے اور ان تصاویر میں یوں رنگ بھرے ہیں کہ تمام تر احوال اپنی حقیقت سمیت قاری کے ذہن پر نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان تمام تر حالات و واقعات نے نشاط فاطمہ کو گہرا متاثر کیا اور وہی نقش ان کی تحریروں میں واضح نظر آتا ہے۔ [27]

نشاط فاطمہ نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول بھی لکھے۔ جن کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے ناولوں میں سقوطِ ڈھاکہ کی جھلک جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ ان کا ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں لکھا جانے والا کمال کا ناول ہے۔ کیوں کہ یہ ناول نشاط فاطمہ نے ڈھاکہ میں رہائش کے دوران تلخ تجربات کی بنا پر تحریر کیا۔

حوالہ جات

1۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، سنگِ میل پبلیشر، لاہور، 2006، ص، 120

2۔ ایضاً۔ ص، 136

3۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، "تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات"، مثال پبلی کیشنز، لاہو، 2016، ص، 136

4۔ Orignal text:https//en.Wikipedia.org/wiki/jonathan_dollimorw۔
September,06, 06:45

5۔ ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج، مترجم یاسر جواد، مقتدرہ قومی زبان اردو، اسلام آباد، 2009، ص 174

6۔ Arm veeser, H, the new historicism , Rouledge, London and New York, 1989, page, 11

7۔ Arm veeser, H, the new historicism , Rouledge, London and New York, 1989, page, 11

8۔ Arm veeser, H, the new historicism , Rouledge, London and New York, 1989, page, 13

9۔ ریاض صدیقی، نو تاریخیت، (نو تاریخیت، ڈاکٹر نسیم عباس احمر)، مثال پبلیکیشنز، فیصل آباد، 2018، ص، 48

10۔ ایضاً، ص 41

11۔ پیٹر بیری، "بیگنگ تھیوری"، مترجم، الیاس بابر اعوان، عکس پبلی کیشنز، لاہور، 2018، ص، 189

12۔ new historicism – Wikipedia 1 https://en.m.wikipedia.org/
November 2021, 6:33 pm

13۔ https://www.merriam-webster.com/dictionary/New%20Historicis, 1st November 2021, 7: 56 pm

14۔ ریاض صدیقی،نو تاریخیت،(نو تاریخیت،ڈاکٹر نسیم عباس احمر)،مثال پبلیکیشنز،فیصل آباد،2018،ص، 49

15۔ original text: https://courses.lumenlearning.com/culturalanthropology/chapter/culturel-materialism/ ,11 November 2021,time 12:14 pm

16۔ http://link. Springer/New historicism& cultural materialism. 12 November 2021, time 9,33 am

17۔ Raymond Williams, "Dominant, Residual & Emergent", Twentieth century Literary Theory (Edited by K.M. Newton),London Macmillan, 1985, P.243_244

18۔ تصنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری، فکر و فن کا جائزہ،(مقالہ) برائے ایم۔اے، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،اسلام آباد،ص،10

19۔ ایضاً۔ص،12

20۔ ایضاً۔ص،81

21۔ الطاف فاطمہ،شہاب صاحب کے خاندانی پسِ منظر کی ایک جھلک، مشمولہ،پنجاب یونیورسٹی،ص 28

22۔ رؤف ظفر (کالم: الطاف فاطمہ ایک خاموش عہد، چپ چاپ ختم ہو گیا) پاک ٹی ہاؤس، روزنامہ: جنگ (5، دسمبر۔2018)ص،16

23۔ تصنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری، فکر و فن کا جائزہ،(مقالہ) برائے ایم۔اے، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ص81

24۔ ماہنامہ، تجدید نو، (نشاط فاطمہ نمبر) ادارت عذرا اصغر، یاداشت (نشاط فاطمہ: میری بہن)، ندیم یونس پریس، لاہور، 1998، ص19

25۔ ایضاً، ص، 19

26۔ ایضاً۔ ص، 29

27۔ نشاط فاطمہ کے افسانوں میں سیاسی کشمکش کے نتیجے میں قنوطی عناصر، ڈاکٹر نازیہ یونس، رسالہ، جہان تحقیق، اشاعت ستمبر 2021، والیم 4، ص132-133

باب دوم:

نو تاریخیت کے تناظر میں "آنسو جو بہہ نہ سکے" اور "چلتا مسافر" کا موضوعاتی مطالعہ

الف: سقوطِ ڈھاکہ

برصغیر میں مسلم حکومتوں کے زوال کے بعد نو آبادیاتی ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگی کسم پُرسی کا شکار تھی۔ ان کے ساتھ جارحانہ سلوک روا رکھا گیا۔ ایسے میں علامہ اقبال نے الگ وطن کے لیے ایک خواب دیکھا، جس کی تعبیر قائدِ اعظم کی کوششوں اور انتھک محنت سے ہمیں قیامِ پاکستان کی صورت میں ملی۔ الگ وطن کے حصول کی اس راہ میں دشمن ملک ہندوستان نے بہت سی سازشیں کیں، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ قائدِ اعظم نے الگ وطن کا خواب تمام مسلمانوں کی آنکھوں میں بھی سجا دیا۔ چناں چہ ہندوستان کے مسلمانوں نے یکجا ہو کر ایک الگ وطن کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

الگ وطن کی اس جدوجہد میں نہ صرف ہندوستان کے مسلمان شامل تھے بلکہ خطہ بنگال نے بھی بھر پور حصہ لیا۔ ان سب کے جوش و خروش اور کاوشوں ہی کا نتیجہ تھا کہ 1947 میں مسلمان ایک الگ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، جہاں مسلمانوں کو ہر طرح کی آزادی دی گئی۔ یعنی یہ کہنا ہر گز غلط نہ ہو گا کہ پاکستان بنانے والوں میں سب سے اہم کردار بنگال کا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی اور جبر کو برداشت کرتے ہوئے بنگال کے مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ان کو سیاسی اور معاشی استحصال سے بچنے اور اپنی تہذیب و ثقافت کی بقا کے لیے کوئی بڑا قدم اُٹھانا ہی پڑے گا۔ اور یہ قدم ہندوؤں سے علیحدگی کی صورت ہی ممکن ہے۔ چناں چہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت 1906ء میں مسلم لیگ کے نام سے بنگال میں بنائی گئی۔ ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو انگریز اور ہندوؤں کی غلامی سے آزادی کا یہ واحد طریقہ نظر آیا۔ لہٰذا 1946 کے انتخابات میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے مسلم لیگ کو ووٹ دیا۔ نتیجتاً مسلمانوں کی قربانیوں اور قائدِ اعظم کی محنتوں اور کاوشوں سے اسلامی ریاست "پاکستان" وجود میں آیا۔ یہ اسلامی مملکت دو حصوں پر مشتمل تھی۔ ایک کا نام مشرقی پاکستان جو کہ موجودہ بنگال ہے اور دوسرا مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) رکھا گیا۔ اس حوالے سے منظور احمد لکھتے ہیں۔

" پاکستان کا وجود ہر اعتبار سے ہی ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن خاص اعتبار سے نہایت ہی انوکھا اور محیر العقول تجربہ ہے۔ جس کی شاید ہی کوئی نظیر موجود ہو۔ اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کر دیا جائے تو دنیا کے مروجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جاسکتا۔"[1]

ہندوؤں نے اپنی برتری اور انابر قرار رکھنے کے لیے بہت مخالفتیں کیں۔ لیکن 14 اگست 1947 کو مسلمان ایک الگ اسلامی ریاست بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ خود مختار اسلامی مملکت دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی پاکستان اور ان دونوں کے درمیان دشمن ملک ہندوستان جو کہ سازشیں کرنے سے پھر بھی باز نہیں آیااور قیامِ پاکستان کے بعد بھی دونوں حصوں کو آپس میں لڑوانے کی کوشش کرتا رہا۔ ہندوستان بہت جلد ہی اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ ہندوستان نے مشرقی پاکستان کے دلوں میں ہمارے لیے نفرت پیدا کرنی شروع کر دی۔ مغربی پاکستان ان تمام تر سازشوں سے بے خبر اقتدار کی ہوس میں مدہوش تھا۔ چناں چہ وہ ملک جس کے بنانے کی وجہ ایک الگ اسلامی اور خود مختار ریاست تھا، اب اپنا نصب العین بدل چکا تھا۔ ایسے میں پاکستان ثقافتی، لسانی، جغرافیائی اور نسل پرستی کی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا۔ حکمران سیاست کے نشے میں اس قدر چور تھے کہ انھیں اپنے سے کئی میل دور مشرقی پاکستان میں موجود اپنے بھائیوں کے دکھ، درد اور بھوک کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اس حوالے سے سلیم منصور خالد رقم طراز ہیں: " بنگلہ دیش کا قیام کوئی اتفاقی یا حادثاتی وقوعہ نہیں تھا، بلکہ یہ ہماری حماقتوں اور نااہلیوں سے لکھی ہوئی داستان المناک مگر منطقی انجام تھا۔"[2]

دشمن ملک ہندوستان نے اس بات کا بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ ہندو مسلمانوں کا ازلی دشمن رہا ہے۔ اوراس لیے ہندو رہنماؤں نے ان کے خلاف شروع سے ہی سازشیں کرنی شروع کر دیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشرقی پاکستان صنعت اور تجارت کے حوالے سے بہت مشہور تھا اور ہندوستان ان کی صنعتوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ صوبائی عصبیت کی بنا پر ہندوستان نے پاکستان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور بنگالیوں کے دلوں میں اس چنگاری کو ہوا دی جس کی وجہ سے پاکستان کے حکمرانوں کے ہاتھوں سے ان کا استحصال کیا جارہا تھا۔ قائدِ اعظم اس وقت ان تمام حقائق اور سازشوں سے آگاہ تھے اور انھوں نے مسلمانوں

کو بھی سمجھایا کہ پاکستان کے دشمن ان کو آپس میں لڑوانے اور پھوٹ ڈلوانے کے لیے بنگلہ اور غیر بنگلہ زبان کا مسئلہ پیدا کر رہے ہیں۔ جو پاکستان کے لیے خطرے سے کم نہیں ہے ۔ اس لیے انھوں نے کہا کہ صوبائی عصبیت کے پیدا ہونے کی بجائے ایک قوم بن کر ان کا سامنا کریں اور ان کو ان کے ناپاک ارادوں میں شکست دیں۔ قائد اعظم نے پاکستانیوں کو صرف مسلمان اور پاکستانی ہونے پر زور دیا نہ کہ پنجابی، سندھی یا بنگالی ہونے پر، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ دشمن مسلمانوں کی اسی خامی کا فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ مستقبل سے آگاہ تھے۔ اور ایک اچھے لیڈر کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ وہ آنے والے خطرے کو بھانپ لے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہم دشمن کی سازش کو ناکام بنانے کی بجائے خود شعوری یا لاشعوری طور پر اس سازش کا حصہ بن بیٹھے، اور دشمن کی سازش کو کم وقت میں ہی منزلِ مراد تک پہنچا دیا۔ جس کی وجہ سے پاکستان دولخت ہو گیا۔

مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے کی بہت سی وجوہات تھیں جن میں سے ایک زبان کا مسئلہ تھا۔ پاکستان کی قومی زبان اُردو تھی۔ جبکہ مشرقی پاکستان نے یہ مطالبہ کیا کہ بنگلہ زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ جیسے اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہے اسی طرح بنگالی کو بھی سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ لیکن پاکستان نے ان کے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ قائدِ اعظم نے 24 مارچ 1948 کو ریس کورس ڈھاکہ میں ایک خطاب کیا جس میں انھوں نے کہا:

> "جہاں تک ریاست کی قومی زبان کا تعلق ہے تو میں یہ بات واضح کر دوں کہ صوبے کے اندر سرکاری سطح پر صوبہ کوئی بھی زبان اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن ہمیں ایک رابطے کی زبان بھی درکار ہے۔ ایک ایسی زبان جو تمام صوبوں کے درمیان رابطے کی زبان ہو اور وہ زبان صرف اور صرف اردو ہی ہو سکتی ہے، وہی زبان جسے اس برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے باہمی طور پر پروان چڑھایا ہے۔ ایک ایسی زبان جسے پورے برِ اعظم کے طول و عرض میں سمجھا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ایک ایسی زبان ہے جو باقی کسی بھی صوبائی زبان سے کہیں بڑھ کر اسلامی کلچر اور روایات سے مطابقت رکھتی ہے اور دیگر اسلامی ممالک کی زبانوں کے بھی قریب تر ہے۔"[3]

قائدِ اعظم نے اردو زبان کی اہمیت پر بہت زور دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اردو ہندوستان میں مقیم مسلمانوں کی بولی جانے والی زبان تھی۔ تقسیم کے بعد یہ زبان مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ قائداعظم نے اس کی اہمیت پر اس لیے بھی زور دیا کہ یہ اردو زبان عربی زبان سے ملتی جُلتی ہے، اور عربی میں مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآن مجید بھی نازل ہوا۔ یہ چوں کہ فارسی و عربی کی طرح دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اس زبان کو قومی زبان کے لیے فوقیت دی۔ اس سب کے بعد بنگلہ دیش کی عوام کے دل میں بال آگیا اور انھوں نے سوچا کہ اردو مغربی پاکستان کی اپنی زبان ہے اور یہ وہاں پر بولی جاتی ہے۔ جبکہ مشرقی پاکستان کے لوگ بنگالی زبان سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان پر اردو زبان مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بنگالیوں کا ماننا تھا کہ مشرقی پاکستان کے ہر صوبے کی اپنی الگ زبان ہے جیسے پنجاب میں پنجابی، سندھ میں سندھی اور بلوچستان اور خیبر پختون خواں میں بلوچی اور پشتو بولی جاتی ہے اسی طرح بنگالیوں کے لیے بھی الگ زبان ہونی چاہیے۔ 26 جنوری 1952 کو پاکستان کی سرکاری زبان اردو منتخب ہوئی جس سے مشرقی پاکستان میں مخالفتیں بڑھنے لگیں اور جلسے جلوس ہونے لگے۔ ایسے میں ہندوؤں نے موقعے سے فائدہ اُٹھایا اور بنگالی لٹریچر کی ترویج کرنی شروع کر دی۔ اس طرح ان تحریکوں کا آغاز ہوا جن کی بدولت سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا۔ 1956 میں ایک ایکٹ پاس ہوا جس میں اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان کو بھی برابری کا درجہ دیا گیا۔ لیکن اس وقت تک سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب پیدا ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نوزائیدہ ملک پاکستان اپنی تشکیل کے فوراً بعد مختلف مسائل کا شکار ہو گیا۔ اور یہ مسائل کیوں کر نہ ہوتے جب ان دونوں ملکوں کے درمیان جغرافیائی فاصلہ ہی ایک ہزار میل تھا۔ آزادی کے بعد پاکستان کے دونوں حصوں میں کئی ہزار میل کا فاصلہ تھا اور ان دونوں حصوں کے درمیان دشمن ملک ہندوستان جس نے کبھی بھی ان کے وجود کو الگ سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ قائداعظم نے ان دونوں حصوں کو ایک کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی اور ہندوستان سے خشکی کے راستے کا مطالبہ کیا لیکن ہندوستان نے ہمیشہ کی طرح خطرناک دشمن ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے اس مطالبے کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ اگر بحری راستے کی بات کریں تو وہ بہت مشکل تھا کیوں کہ اس طرح سے بھی بھارت کسی بھی وقت بحری راستہ بند کر دیتا تھا۔ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان ہوائی فاصلہ دو گھنٹوں کا تھا۔ اس صورتِ حال میں بھی ہندوستان کی فضائی حدود میں سے

گزر کر ہی جایا جا سکتا تھا۔ لیکن بھارت نے بہت ہی چالاکی کے ساتھ ایک بھارتی طیارہ اغوا کروا دیا اور الزام پاکستان پر لگا دیا جس کی وجہ سے پاکستان کی ساری پروازیں جو ہندوستان سے ہو کر گزرتی تھی ان کو بند کر دیا۔ ایسے میں جو سفر دو گھنٹے میں آسانی سے ہو جاتا تھا اب بڑھ کر چھ گھنٹے پر مشتمل ہو گیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "جغرافیائی لحاظ سے بھی مشرقی پاکستان کی حیثیت بڑی نازک تھی۔ اس کے اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل کا طویل بھارتی علاقہ حائل تھا۔ مشرقی پاکستان کا صوبہ تین اطراف سے بھارتی علاقے سے گھرا ہوا تھا۔"[4]

ایسا ملک جس میں اس قدر طویل فاصلہ ہو اور چاروں اطراف ازلی دشمن گھات لگائے بیٹھا ہو، اس ملک میں امن و سکون کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اس دوری کی وجہ سے جنگ کے دوران پاکستانی فوجیوں کے لیے مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان جانا ناممکن ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جغرافیائی فاصلہ سقوطِ مشرقی پاکستان کا سبب بنا۔ تقسیمِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے لوگوں کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی، جس کے وہ اصل میں حقدار تھے۔ پاکستان بنانے میں سب سے زیادہ اہم کردار بنگالیوں کا ہے اور بنگالیوں نے پاکستان بنانے کے لیے بہت سی قربانیاں دیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی ان کی زندگی میں آسانیوں کی بجائے مشکلات بڑھتی چلی گئیں۔ اس کی بڑی وجہ سیاسی محرومی تھی اور یہ محرومی مارشل لاء کے نفاذ کے بعد مزید بڑھ گئی۔ بنگالیوں کے ساتھ سیاسی ناانصافی تو قیامِ پاکستان سے پہلے ہی ہوتی رہیں تھیں۔ جب 1945-46 کے انتخابات کے بعد سندھ اور بنگال میں مسلم لیگ کی وزارتیں قائم ہوئیں۔ جس میں مسلم لیگ کے لیے مشرقی پاکستان کی طرف سے لیاقت علی خان اور دیگر سیاسی شخصیات شامل ہوئیں۔ جبکہ صوبہ بنگال کی طرف سے غیر معروف راہنما جوگندر ناتھ منڈل کو کابینہ میں شامل کیا گیا۔ جس پر بعد میں تنقید بھی ہوئی۔ اسی وجہ سے 1947 میں ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جب پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کی حد بندی کی تو اس موقعے پر مسلم لیگ، کانگرس اور سکھوں کے نمائندہ راہنما شامل ہوئے جن میں لیاقت علی خان، قائداعظم اور سردار عبدالرب نشتر جیسے نام ہیں، جبکہ مشرقی پاکستان کے کسی بھی رہنما کو شامل نہیں کیا گیا۔

اب معاشی حیثیت کی بات کریں تو مشرقی پاکستان کی نسبت مغربی پاکستان کافی آگے تھا۔ یہ معاشی پسماندگی قیامِ پاکستان سے پہلے بھی بنگالیوں کے حصے میں تھی اور قیامِ پاکستان بعد میں بھی اسی طرح ہی رہی۔ مشرقی پاکستان کی معیشت پاکستان کے قیام سے پہلے کلکتہ کے زیر نگرانی تھی۔ بنگلہ دیش کی پیداوار میں سب سے زیادہ پٹ سن کی فصل تھی۔ جس کے کارخانے کلکتہ کی بندرگاہ پر واقع تھے۔ اس لیے انھیں برآمدات کے لیے غیر معیاری بندرگاہ پر انحصار کرنا پڑتا تھا جو کہ چٹاگانگ میں تھی۔ اب میں بنگالوں کا یہ غصہ بھی قدرے جائز تھا کہ پیداوار ان کی اپنی ہے اور اس سے فائدہ مغربی پاکستان کو ہو رہا ہے۔ ایسے میں مرکزی حکومت نے بھی مشرقی پاکستان کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ یعنی صنعتوں کے قیام کا جب وقت آیا تو حکومت نے مشرقی پاکستان کی بجائے مغربی پاکستان میں صنعتوں کے قیام کو عمل میں لایا۔ اس طرح بے روزگاری، غربت، افلاس اور انواع قسم کی بیماریوں نے مشرقی پاکستان میں رہنے والے ہر انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ان کی حیثیت یہاں پر نو آبادیاتی مسلمان بنگالیوں سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے۔ 1947 کے بعد مشرقی پاکستان سیاسی طور پر تو ہندوستان سے کسی طرح آزاد ہوا، مگر اقتصادی طور پر اب مغربی پاکستان کا غلام بن گیا تھا۔ ایسے میں شیخ مجیب الرحمٰن نے چھ نکات پیش کیے۔ جس کی ایوب خان نے شدید مذمت کی اور اسے علیحدگی کا پیغام سمجھا۔ اس حوالے سے صدیق سالک نے اپنی کتاب "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا ہے" میں کہا کہ:

> شیخ مجیب الرحمٰن نے لاہور میں اپنے مشہور چھ نکات کا اعلان کیا۔ چھ نکات میں بنیادی طور پر ایک ایسے سیاسی بندوبست کی وکالت کی گئی تھی، جس میں مرکزی حکومت محصولات کے اختیارات کے بغیر امور خارجہ اور امور دفاع کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ مجیب نے اپنے پروگرام کو "صوبائی خود مختاری" کے حوالے سے پیش کیا، جبکہ مغربی پاکستان کے لوگوں نے اسے علیحدگی کی تحریک سمجھا۔"[5]

بھارت نے اس موقع کا فائدہ اُٹھایا اور مجیب الرحمٰن کے ان چھ نکات کو اپنے خصوصی پروگرام آل انڈیا ریڈیو پر نشر کر دیا۔ ان کا یہ کرنے کا مقصد صرف اور صرف بنگالیوں کے دل میں مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کو پیدا کرنا تھا اور مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنے پر اُکسانا تھا۔ اسی عرصے میں "تلہ سازش کیس (1967)" سامنے آگیا۔ جس میں ملٹری انٹیلی جنس کا یہ کہنا تھا کہ سول افسران بھارت کے خفیہ

ایجنٹوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور وہ مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ ابھی اس کیس کی سماعت جسٹس ایس۔ اے رحمٰن کی سربراہی میں چل ہی رہی تھی کہ اس بات کی اطلاعات آنے لگیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن بھی ان کے ساتھ سازش میں ملوث ہیں۔ تلہ سازش کیس ایوب خان کے لیے بڑے امتحان سے کم ہر گز نہ تھا۔ کیوں کہ اس نے ایوب خان کے اقتدار کو کمزور کر دیا تھا۔ اسی دوران ایوب خان پر ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے (منی لانڈرنگ) کا الزام بھی عائد ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یحییٰ خان نے سیاسی اقتدار سنبھالا۔ اور یوں اقتدار میں آتے ہی انھوں نے دوسری بار مارشل لاء نافذ کر دیا۔ 1970 میں یحییٰ خان نے عام انتخابات کا اعلان کیا جس میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی بڑی سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا۔ جن میں مسلم لیگ، جماعتِ اسلامی، پاکستانی ڈیموکریٹک پارٹی اور پیپلز پارٹی جیسی سیاسی جماعتوں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان مذکورہ جماعتوں میں عوامی پارٹی اور پیپلز پارٹی دو ایسی جماعتیں ہیں جن کے مابین کشید گی کبھی ختم نہیں ہوئی۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان گفتگو ہمیشہ اشتعال انگیز ہوتی تھی۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل یعقوب کو مشرقی پاکستان کا گورنر منتخب کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان کی عوام نے حکومت کے اس فیصلے کی مذمت کی اور اس کو غیر دوستانہ قدم سمجھا، جس سے ان کے اندر غم و غصہ مزید بڑھ گیا۔ مسعود مفتی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "سقوطِ ڈھاکہ ایک انتہائی پیچیدہ عمل کی انتہا ہے۔ اس کی پیچیدگی میں نیتوں کا کھوٹ، جماعتوں کی تکرار، سازشوں کا جال، اقتدار کی بھوک اور نظریے کا الحاد سبھی کچھ شامل ہے"[6]

چناں چہ جب بنگالیوں نے دیکھا کہ ان کے ساتھ اس قدر زیادتی ہو رہی ہے تو انھوں نے بڑے پیمانے پر بغاوت شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا۔ اب امکان اس بات کا تھا کہ فوج کی مداخلت سے مشرقی پاکستان کے حالات بہتر ہوں گے اور اس سرزمین پر اب صرف امن ہی امن ہو گا، مگر افسوس کہ ایسا بھی نہ ہوا اور ملک میں خانہ جنگی کی نوبت آ گئی۔ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری اور فوجی عملداری سے بھارت نے ہمیشہ کی طرح فائدہ اُٹھایا۔ اس نے نہ صرف پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی بلکہ مکتی باہنی کے جارحانہ عمل دخل سے مشرقی پاکستام میں دہشت کی فضا پیدا ہو گئی۔ ان تمام حالات و واقعات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھارت نے 22 نومبر 1971 کو مشرقی پاکستان پر حملہ کیا۔ جس کی وجہ سے 1971 کی جنگ

میں پاکستان کو ناکامی ہوئی اور ہمارا ملک دولخت ہو گیا۔ پاکستان کے دولخت ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگلہ دیش دنیا کے نقشے پر سامنے آ گیا۔

ایک ایسا ملک جو جداگانہ مذہب کی بنا پر 1947 میں بنا تھا۔ لیکن اس ملک کا ایک بڑا صوبہ مشرقی پاکستان جو زبان اور زبان کے لحاظ سے مختلف اور جغرافیائی اعتبار سے کئی ہزار میل دور تھا۔ یہ ایسا ملک تھا جس کا سیاسی انتظام مغربی پاکستان کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے روز مرہ کے مسائل، پریشانیاں اور بیماریاں مغربی پاکستان کی سیاسی جماعتیں سمجھنے سے قاصر تھیں۔ ان حالات کے ساتھ ساتھ ملکی دشمن بھارت کی عملداری اور سازشوں کی بدولت مشرقی پاکستان میں رہنے والے بھائیوں میں احساسِ محرومی بڑھنے لگا۔ اور آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ محرومی نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ یہ نفرت کا ہی ثمر ہے کہ پاکستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔

اردو ادب پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات:

1971 میں ہونے والے سانحے نے لوگوں کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ نہ صرف برصغیر کی تاریخ کا بلکہ مسلمانوں کی تاریخ کا بھی سیاہ ترین باب ہے۔ جس کو پڑھ کر احساسِ محرومی اور احساسِ شرمندگی دونوں بڑھتے ہیں۔ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے میں عالمی طاقتوں کے سامراج کا بڑا ہاتھ ہے جو 1947 میں ملک سے نکالے جانے کے بعد بھی ملکی معاملات میں دخل دینے سے بعض نہیں آئے، اور ساتھ ہی ساتھ ہندو قوم کی ازلی دشمنی نے ہمارے ملک کو دولخت کرنے کے لیے ہر طرح کی سازشیں کیں تھیں، اب یہ سازشیں سیاسی سطح پر ہوئیں یا مقامی سطح پر، بہر حال وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو ہی گئے اور کامیاب کیوں کر نہ ہوتے جب مغربی پاکستان کے سیاست دان اپنے مشرقی پاکستان کے بھائیوں کو بھول کر اقتدار کے لالچ میں مدہوش تھے۔ چناں چہ متحدہ پاکستان کے سیاسی لیڈران کی بدعنوانیوں اور سیاسی پالیسیوں کی بدولت جو نتائج ہمارے سامنے آئے وہ سقوطِ ڈھاکہ کی شکل میں ہماری تاریخ کے سیاہ پنوں میں شامل ہو گئے۔ اس حوالے سے "وطن کا قرض" کے مرتبین نے اپنے مجموعے میں کہا کہ:

" 1947 سے 1971 تک کے عرصہ کو انتشار فکر و نظر کا دور کہا جا سکتا ہے۔ سازشوں کے جال بچھائے جا رہے تھے۔ کوتاہ قد اور کوتاہ فکر قائد قوم کے سر پر مسلط کیے جا رہے تھے۔ سرگوشیاں نعروں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ مشرق میں مغرب کو لوٹ مار کا ذمہ دار اور مغرب میں مشرق کو اقتصادی بدحالی کا سبب قرار دیا جا رہا تھا۔"[7]

اب ایسے میں کون کتنا قصور وار تھا اور کس کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے تھا؟ لیکن نہیں کیا، ہندوؤں نے کس طرح موقع کا فائدہ اُٹھایا؟ سامراجی طاقتیں ملک سے جانے کے بعد بھی کن ذرائع سے اس سانحے میں ملوث رہیں؟ اردو فکشن نے ان تمام پہلوؤں پر مختلف اصناف میں تفصیل سے لکھا۔ کیوں کہ سانحۂ سقوطِ ڈھاکہ نے اس وقت کے لکھنے والوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جیسے کہ عموماً کہا بھی جاتا ہے کہ قاری کسی بھی معاشرے کا حساس ترین طبقہ ہے اور ان پر اس طرح کے واقعات گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ ایسے میں بہت سے ادیبوں نے اس دور کے سیاسی و سماجی حالات و واقعات کو اپنی تصانیف کا حصہ بنایا۔ تقسیم کے بعد پاکستان بہت سے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی مسائل کا شکار رہا اور ان تمام مسائل کو ادیبوں نے اپنی تصانیف کا موضوع بنایا۔ غرض یہ کہ اردو ادب نے ہجرت سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک کے تمام واقعات کا اثر لیا۔ ادب کی اس تفہیم کے بارے میں ڈاکٹر محمد افضال لکھتے ہیں:

"مشرقی پاکستان کے سقوطِ کے بعد ادب کہیں انسان کی انسانی پر درندگی کی داستان رقم کرنے لگا تو کہیں مکتی باہنی کے ظلم و ستم کی منہ بولتی تصویریں پیش کرنے لگا۔ اس طرح 70 کی دہائی کے آغاز پر اردو فکشن کے موضوعات میں اضافہ ہو گیا۔"[8]

قیامِ پاکستان کے بعد ہونے والے واقعات میں 1947 کا غدر، ہجرت کے مسائل، 1965 کی جنگ اور سقوطِ ڈھاکہ جیسے دل خراش واقعات ہوئے، جس پر بہت سے ادیبوں نے لکھا۔ لیکن سقوط ڈھاکہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے ہر صنف سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور لکھاریوں پر اثرات مرتب کیے اور انھوں نے اپنی کہانیوں میں اس واقعے کو پیش کیا۔ جس میں انھوں نے مشرقی پاکستان کے طویل پسِ منظر کو سیاسی اور تاریخی حیثیت سے اپنی کہانیوں میں شامل کیا۔ اردو فکشن میں سقوطِ ڈھاکہ کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ملک میں جو سیاسی حالات مارشل لا (1957) کی وجہ سے ہوئے اس

کے نتیجے میں چوں کہ اظہار پر پابندی عائد کر دی گئی تھی جس سے لکھاریوں کے لیے لکھنا مشکل ہو گیا تھا، اس لیے مصنفین نے ناول اور افسانوں میں مختلف ہئیتی تجربے کیے، اسلوبیاتی اور تکنیکی تجربات فکشن کا حصہ بنے، علاوہ ازیں علامتی انداز میں بھی تحریریں لکھیں گئیں۔ جس میں ڈھکے چھپے انداز میں اپنی بات بیان کی گئی۔ جس سے مصنفین میں خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلیت کے تمام تر پہلو بھی ابھر کر سامنے آئے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر زینت افشاں کہتیں ہیں کہ:

> "اردو فکشن میں ان ناولوں کو پڑھ کر جنگ کے دنوں کا مکمل نقشہ قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ اسے سقوطِ ڈھاکہ سے قبل مشرقی پاکستان کے حالات سے آگہی حاصل ہوتی ہے اور پھر وہ ان حالات کو اپنے انجام کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ناولوں میں حالات و واقعات ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے قاری کو اصل حقائق تک پہنچا دیتے ہیں۔"[9]

آنسو جو بہہ نہ سکے کے عمومی موضوعات (سیاسی و سماجی، مذہبی)

دنیا کی تیز رفتاری اور مشینی دور میں انسان خود بھی مشین بن کر رہ گیا ہے۔ نفسا نفسی کے اس دور میں ہم خونی رشتوں کے تقدس کو کھوکھلا کر رہے ہیں اور انسانیت ہم سے دور کہیں کھو گئی ہے۔ طاقت ور لوگ طاقت کے بل بوتے پر غریب اور مجبور لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے غریب طبقے کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری آئندہ نسل بھی اس قسم کے مسائل کا شکار ہو گی۔ ایسے میں نشاط فاطمہ اخلاقی زوال کو مد نظر رکھ کر اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ اپنے ہاتھ سے خود محنت کر کے ثمر پانے والے قدیم روائتی لوگ آج کے صنعتی ترقی یافتہ جدید لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر تھے، کیوں کہ ان کو وضعدار لوگوں کو اخلاقی اقدار کا اندازہ بہت اچھے سے تھا۔ اس جدید دور نے انسان کے اندر کی معصومیت کو ختم کر کے اس میں مکاری اور عیاری بھر دی ہے۔

نشاط فاطمہ نے ہر طرح کے موضوع پر قلم اُٹھایا۔ خواہ وہ انسان کو انسان کی تلاش ہے یا ملک میں رونما ہونے والے پے در پے واقعات ہیں۔ نشاط فاطمہ کی کہانیوں کے موضوعات میں اعلیٰ اخلاقی اقدار، کھوکھلی انسانیت، امن و چین کی تلاش کا سفر، روحانیت، ملکی فسادات اور سب سے بڑھ کر سانحہ سقوطِ ڈھاکہ (1971)

کی وجوہات اور انسان کا انسان کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک وغیرہ شامل ہیں۔ پاکستان کے دولخت ہونے کا نشاط فاطمہ پر کچھ اس لیے بھی زیادہ اثر ہوا کیوں کہ وہ شادی کے بعد اپنے شوہر انیس کے ہمراہ کچھ عرصہ بنگلہدیش میں رہائش پذیر رہیں۔ وہاں کے لوگوں کے ساتھ رہ کر اور ان کی زندگی اور مسائل کو قریب سے جاننے کی وجہ سے ان پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اور یہ اثرات ان کی کہانیوں میں جابجا نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے نشاط فاطمہ نے اپنے ناول " آنسو جو بہہ نہ سکے " میں ان تمام مشاہدات کو پیش کیا جو انھوں نے دیکھے۔ مصنفہ کو بنگلادیش میں رہنے والے بہاریوں سے خاصہ لگاؤ تھا، یہ لگاؤ اور ہمدردی ان کے الفاظ کی صورت میں ہمیں ناول میں کئی جگہ نظر آتی ہے۔

ان کی کہانیوں کے کردار اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔ نشاط فاطمہ نے ناول میں نہ صرف سیاسی حالات کو رقم کیا بلکہ محبت کی ایک لازوال کہانی بھی ناول کا حصہ رہی جس میں دو محبت کرنے والے لوگ صبر اور شکر کی بدولت ایک دوسرے تک رسائی نہ ہونے کے باوجود بھی بہت عقیدت کے ساتھ محبت کو نبھاتے ہیں۔ یہ عقیدت ان کے اعلیٰ اخلاق کی ترجمان ہے۔

"آنسو جو بہہ نہ سکے" کے سیاسی موضوعات

نشاط فاطمہ کا ناول " آنسو جو بہہ نہ سکے " موضوع کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس میں مصنفہ نے مختلف موضوعات کو ناول کا حصہ بنایا، لیکن ان کی یہ خوبی ہے کہ تمام موضوعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

" آنسو جو بہہ نہ سکے " میں ایک انگریز خاندان جو انگلستان چھوڑ کر ملازمت کی غرض سے ہندوستان اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ منتقل ہو رہا ہے۔ لارڈ ہمفری روانگی سے قبل اپنی بیوی لیڈی ہمفری کو موجودہ ہندوستان کے حالات کے بارے میں بتا رہے ہیں، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں اب انگریزوں کا وہ رعب نہیں رہا جو پہلے تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اب وکٹورین دور ختم ہو گیا ہے اور دوسرا ہندوستان میں رہنے والی دو قوموں ہندو اور مسلم آباد ہیں جو اب پہلے کی طرح غلامانہ سوچ نہیں رکھتی۔ انھوں نے لیڈی ہمفری کو موجودہ حالات کے بارے میں بتایا۔

میں کام میں مصروف رہوں گا مگر تم احتیاط سے کام لینا۔ اور ان سے گھلنے ملنے کی کوشش کرنا، آنٹ ہیرئٹ کے خیال میں ہندوستانی جنگلی اور غیر مہذب ہوتے ہیں۔ نہ وہ جنگلی ہیں نہ غیر مہذب۔ اسی خیال کے تحت یہاں سے بے کار قسم کے لارڈز، جن کے پاس کچھ کرنے کو نہ تھا، تنگ دستی کا شکار ہونے والے ہیں۔[10]

یہی وہ دور ہے جس میں نو تاریخی عناصر نے جنم لینا شروع کیا۔ فرنگی حکمرانوں کے ہاتھوں سے اقتدار اب آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ بیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں ہی نو تاریخی عناصر نے آگے آنے والے قارئین کے لیے سوچ کا ایک نیا در وا کیا۔ جس سے وہ پہلے آشنا نہ تھے۔ انہی عناصر نے ادب میں ایک نئی طرز متعارف کی جس میں تاریخ کی ان بیانات کو بھی قاری نے پرکھا جو اس سے پہلے کسی وجہ سے سامنے نہ آسکے۔ چناں چہ قاری کسی بھی عہد کے ادب میں اس دور کے تناظرات کو سمجھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے نو تاریخیت کی تھیوری خاص اہمیت کی حامل ہے۔ کیوں کہ نو تاریخیت کی بدولت ہی آپ کسی بھی ادب پارے کو گہرائی سے سمجھ جاتے ہیں۔ نشاط فاطمہ کے ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" میں ہمیں نو تاریخی عناصر جگہ جگہ نظر آرہے ہیں۔

"آنسو جو بہہ نہ سکے" میں 1937 کے ہندوستان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جس میں ہندوستانی عوام انگریز حکمرانوں سے عاجز آکر اب باغیانہ روش اختیار کر رہے تھے۔ اپنے حقوق کے لیے سیاسی طور پر اکٹھے ہو کر انگریزوں سے اپنے حق کے لیے مطالبات کر رہے تھے۔ اور اس وقت تک انگریز بھی اتنا مضبوط نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے چیف کمشنر لارڈ ہمفری بھی وسوسے کا شکار ہو کر سر مورس کے ساتھ جام پر جام پی رہے تھے۔ کچھ تم نے سنا؟ انگلستان میں بے کاری بڑھ گئی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہو گیا ہے۔ اس کی رو سے ہندوستانیوں کو اور اصطلاحات دے دی گئی ہیں۔[11]

لارڈ ہمفری کے دونوں بیٹے ایڈورڈ اور پیٹر ہندوستان آکر زیادہ پر جوش نہیں ہوئے۔ لارڈ کا چھوٹا لڑکا پیٹر اس فطرت کا انگریز تھا جن کو اپنے خاندان اور اپنے عہدے سے بہت پیار ہوتا ہے اور یہ عہدہ ان کے اندر غرور پیدا کرتا ہے۔ یہی غرور پیٹر میں بھی تھا جس کی وجہ سے وہ انگریز لوگوں کے سوا کسی سے دوستی نہیں کرتا۔ جبکہ ان کا بڑا بیٹا ایڈورڈ اپنے بھائی سے قطعی مختلف ہے، اس کی انگریزوں کے بچوں کے علاوہ علی سے بھی

دوستی تھی۔ ہندوستان میں اپنا لڑکپن گزارنے کے بعد سے اس کے اندر بھی ایک خاص قسم کا ٹھراؤ تھا جو ہندوستان سے آنے والے انگریزوں میں ہوتا ہے، جس کی وجہ سے انگریز عورتیں اس کی شخصیت سے مرعوب ہوتیں تھیں۔ ایڈورڑ خواہ ایک خالص انگریز تھا مگر اس کی روح مشرقی اقدار پسند تھی۔ وہ اکثر ملکی حالات پر بھی اپنے باپ کے سامنے نڈر ہو کر بول پڑتا تھا۔

> اس ملک پر ہمارا حق کہاں سے آگیا؟ یہ قطعی بے ایمانی سے حاصل کیا گیا تھا۔ ایک عرصے سے انگلستان اس پر پل رہا ہے۔ انگریز اس کی گاڑھی کمائی، ان کے کھیتوں کا اناج، ان کا قیمتی جوٹ سب باہر بھیج رہے ہیں۔ یہاں کسان بھوکا مرتا رہا۔ ہم نے ان کے فنکاروں کی آنکھیں نکلوا دیں۔ ہاتھ کٹوا دیے۔۔۔۔ ہمیں `ڈی ولیرا کی قدر کرنا سکھائی گئی کیوں کہ وہ آئرلینڈ کی آزادی کے لیے کوشاں رہا۔ اُس نے اِس کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ مگر ہمیں سراج الدولہ سے نفرت کرنا سکھایا گیا۔ غلامی ہر قوم کے لیے ایک لعنت ہے۔[12]

درجِ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ اچھا انسان صرف وہ نہیں ہے جو اچھا مسلمان یا اچھا شہری ہے بلکہ اچھا انسان اپنی سوچ اور عمل سے بنتا ہے۔ انسان کی سوچ اس کو انسانیت کی اعلیٰ معراج تک پہنچاتی ہے۔ نشاط فاطمہ کے تخلیق کردہ اعلیٰ صفت کے کردار نہ صرف مسلمان ہیں اور نہ صرف ہندو بلکہ دردِ دل رکھنے والا ہر انسان خواہ وہ انگریز ہو یا عیسائی، ان کے ناول میں حاوی رہے ہیں۔

نشاط فاطمہ نے اپنے ناول میں اس کلچر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں کسی قسم کی ذات پات کی تقسیم نہیں ہے۔ معاشرہ اونچی اور نچلی ذاتوں کی تقسیم سے آزاد ہے۔ مذہب میں بھی میانہ روی ہے۔ نشاط فاطمہ مذہب میں شدت پسندی کی بجائے ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور خلوص رکھنے کی قائل تھیں۔ انھوں نے اپنے ناول میں یہ بات کی کہ اعلیٰ اقدار پر صرف اونچے طبقے کا حق نہیں ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ تہذیب و تمدن کی اصل روایات ہمیں نچلے طبقے سے ملتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا ادب ہو یا تاریخ، اس میں اعلیٰ طبقات کو ہی اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟ تاریخ ہو یا ادب ہر جگہ اشرافیہ کا ہی ذکر ہے۔ اگر کہیں ادنیٰ طبقے کا ذکر ہو بھی جائے تو اس کو ذلت اور رسوائی سے جوڑتے ہیں۔ ان اعلیٰ طبقات کی باگ دوڑ

طاقتور کے ہاتھ میں ہے۔ نشاط فاطمہ نے اپنے ناول کے ذریعے یورپی تہذیب کے ماننے والے نو آبادکاروں میں بعض کے کردار ایسے تخلیق کیے ہیں کہ ناول پڑھنے والے قارئین کو ایک بار تو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ انگریز نہیں بلکہ مسلمان ہے۔ مصنفہ نے گرتی ہوئی اقداروں کو لفظوں کی مدد سے سہارا دیا۔ جس کی وجہ سے مذہب ہو یا سیاست نشاط فاطمہ نے اس میں افتراکیت کو اہمیت دینے کی بجائے اشتراکیت کو اہمیت دی۔ نشاط فاطمہ نو تاریخیت کے بیان میں سیاست کو خاص اہمیت دیتی ہیں۔ کیوں کہ ماضی میں نہ صرف مذہب، سماج، ثقافت، انسانی اقدار میں تبدیلیاں آئیں بلکہ سیاست میں بھی تبدیلی محسوس کی جاسکتی ہے۔ مصنفہ تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے اس دور کے سیاسی معاملات کو پیش کرتی ہیں۔ جس میں واضح ہے کہ ہر دور میں حالات ایک جیسے ہی رہے ہیں۔

1947 میں ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، لارڈ ہمفری اس تقسیم سے ہر گز خوش نہ تھے کیوں کہ انہوں نے ایک عمر اس ملک میں رہ کر حکمرانی کی تھی۔ اب جب ان کو یہاں سے نکالا جارہا تھا تو انہیں اس بات کا بہت قلق تھا۔ انہوں نے ایک خبر پڑھی جس میں کہا جارہا تھا۔

> ہندوستان آزاد ہو گیا۔ بلکہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ یہ فتح ہمیں بڑی مہنگی پڑی۔ ایک طرف ہم نے فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑھے دوسری طرف سے ہم نے اپنا جھنڈا اکھاڑ لیا۔ یعنی بغیر جنگ کے ہار گئے۔ صد افسوس۔[13]

"آنسو جو بہہ نہ سکے" کے سماجی موضوعات

ادب کی بدولت ہی ہم کسی بھی عہد کے سماج اور اس کی اعلیٰ اقدار کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ کسی بھی دور کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن کے بارے میں معلوم کرنا ہو تو ضروری ہے کہ اس ادب پارے کو پڑھا جائے، جس میں اس دور کے سماج کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس سے کسی بھی سماج کے مہذب ہونے کا معلوم ہو جائے گا۔ کیوں کہ ادب سماج میں انسانیت کا قائل ہے نہ کہ فرقہ بندی اور نسل پرستی کا۔ ادب انسان کے اندر کی انسانیت کو بیدار کرتا ہے۔ جس سے اس کا ضمیر بھی تر و تازہ رہتا ہے۔ اور جب ضمیر تر و تازہ ہو گا، تو اس کے اندر موجود نفرت، حسد، بغض، کینہ، عداوت، جلن اور خود غرضی جیسے منفی

عوامل زائل ہوتے رہیں گیں۔ نشاط فاطمہ نے اپنے ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" میں ایسے ہی سماج کی تصویر کشی کی ہے۔ جس کے اندر محبت، امن، خیر سگالی جیسے جذبات موجود ہیں۔

ناول کا آغاز ایک ایسے انسان سے ہوتا ہے جو بنگال کا رہنے والا ہے اور کوڑھ کی بیماری میں مبتلا ہے۔ ناول میں اس دور کی منظر کشی کی گئی ہے جب پورا بنگال کوڑھ جیسی موذی بیماری میں مبتلا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے سراج الدولہ جیسے نرم دل انسان کا دورِ عروج اور زوال دونوں اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، مگر افسوس کہ اب کوڑھ کی وجہ سے اس کی بینائی چلی گئی تھی، ایسے میں اس نے بے بسی سے سوچا۔" ان کے زخموں کا کوئی تو چارہ گر بھی ہو گا، میرے نہ سہی ان آنے والی نسلوں کا۔[14]

نشاط فاطمہ کے ناول میں وہ سماج دکھایا گیا ہے جس میں کوڑھ جیسی بیماری میں مبتلا لوگوں کے ساتھ دوسرے لوگوں کے مختلف رویے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کوئی ان کا احساس کرتا ہے تو کوئی ان سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اور یہ رویہ ہمیں ناول میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ نشاط فاطمہ نے نو تاریخیت کے زمرے میں رہتے ہوئے اس دور کے سماج کی طرف قاری کو متوجہ کیا ہے جس میں غربت، افلاس اور بیماری پورے بنگال میں پھیلی ہوئی ہے۔ نشاط فاطمہ کے ناول میں ایک اور کردار ہے جو دردِ دل رکھنے والی اعلیٰ اقدار اور نیک سیرت لڑکی "زہرہ" ہے۔ زہرہ وکیل صاحب اور ان کی بیوی کی بڑی صاحبزادی ہیں۔ جو اپنی چھوٹی بہن کے مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مرہم کروانے ہسپتال میں آئی۔ ہسپتال کے باہر کوڑھیوں کا رش تھا۔ زہرہ نے دیکھا کہ بھیک مانگنے والے کوڑھی زدہ لوگ درد سے کراہ رہے ہیں اور کمپوڈر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان کے زخموں پر بھی کچھ لگا دیں۔ کمپوڈر نے بہت سخت ہاتھوں سے دوا لگائی، جس سے ان کے زخم مزید دکھنے لگے۔ تو کمپوڈر نے غصے میں کہا کہ مفت کی دوائی دیکھ کر یہ لوگ آجاتے ہیں لیکن دن بھر سڑکوں پر بھیک مانگتے ہیں۔ زہرہ کو یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے وہ سوچتی ہے کہ پہلے ہی ان مریضوں کا پورا جسم زخموں سے چور ہے۔ اس کے باوجود ان کے ساتھ ایسا رویہ رکھا جارہا ہے جبکہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آنے سے بھی ان کو راحت ملے گی۔ وہ ڈاکٹروں سے بھی ناخوش ہوتی ہے۔

تو نہ پڑھا کریں ڈاکٹری۔ جب پڑھتے ہیں تو تکلیف اور دکھ کو محسوس کرنے کے لیے دل بھی لایا کریں۔ ہر ایک کو ڈاکٹر بننا ہی نہیں چاہیے۔ پہلے یہ دیکھا کریں کہ کریں کہ لڑکے کا دل نرم بھی ہے۔ بے حس تو نہیں۔[15]

نشاط فاطمہ اپنے ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" کے ذریعے سماج کے ایک ایسے رویے کی بات کی جو بہت تکلیف دہ ہے۔ انھوں نے زہرہ کے باپ کو جو وکیل تھا اور ماضی میں اس نے دھوکے سے تمام جائیداد اپنے والد کے نام سے اپنے نام کروالی تھی۔ جس کی وجہ سے باقی بہن بھائی بہت مایوس ہوئے۔ لیکن جب زہرہ کا رشتہ وکیل صاحب کے بڑے بھائی نے اپنے بیٹے ارشد کے لیے مانگا تو وہ اس رشتے سے خوش نہیں تھی۔ مگر کسی بھی مشرقی جذبات رکھنے والی لڑکی کی طرح اس نے کوئی حجت نہیں کی بلکہ وہ اس رشتے کے لیے بدل نخواستہ تیار ہو گئی۔ وہ اس سب معاملے میں عیسائیوں کا ایک مشہور مقولہ سوچا کرتی تھی۔

باپ کا گناہ بیٹا بُھگتتا ہے۔ عیسیٰ آدم کے گناہ کی خاطر سولی پر چڑھا۔ اس نے سوچا "چونکہ میرے باپ کا کوئی بیٹا نہ تھا اور میں بڑی اولاد ہوں اس لیے سولی پر چڑھنے جا رہی ہوں۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ "یہ قید بامشقت ہے جو مجھے میرے باپ کے گناہ کی خاطر دی گئی ہے۔ پتا نہیں یہ کیسے کٹے گی۔"[16]

نشاط فاطمہ نے اپنے ناول میں کوڑھ کی بیماری کا ذکر بارہا مرتبہ کیا ہے۔ اور اگر اس کی نو تاریخیت کو دیکھیں تو قاری کو اندازہ ہو گا کہ یہ اس دور کا ناول ہے جب بنگال میں کوڑھ کی بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ کوڑھ کی بیماری جو آج سے سو سوا سو سال پہلے آئی تھی۔ آج کا قاری سو سال پہلے آنے والی موذی مرض سے لاعلم ہے۔ لیکن نو تاریخیت ہمیں اس بارے میں تفصیل سے بتاتی ہے کہ کوڑھ نے اس دور کے انسان پر کس طرح اپنے اثرات مرتب کیے؟ اس دور میں کوڑھ کا علاج نہیں تھا تو لوگوں کے ملے جلے رویے نشاط فاطمہ نے اپنے ناول میں پیش کیے جہاں کچھ لوگوں کو امید تھی کہ ان کے مرض کا علاج کرنے خداوند کسی نہ کسی کو تو ضرور بھیجے گا اور کہیں ایسے مریض بھی تھے جو اس بیماری کی تکلیف سے اتنے عاجز آ چکے تھے کہ وہ یا تو ناامید ہو گئے تھے اور یا پھر اپنی جان لینے کے درپے ہو گئے تھے۔

فرانسس نے جوزف سے کہا" میں نے رات خواب دیکھا ہے اور اس کے آنے کی بشارت لی۔وہ ڈھاکے میں ہے۔اور تم مجھے نوکے میں بٹھا کے لے جارہے ہو اور وہ صورت شکل ہمارے بڑے پادری صاحب سے بھی اچھا ہے"[17]

نشاط فاطمہ نے اپنے ناول میں ایک پختہ یقین دکھایا ہے۔اور اس یقین اور اعتماد کو انھوں نے اپنے ناول میں بھرپور انداز میں تکمیل تک بھی پہنچایا ہے۔ناول میں جہاں اس قدر درد میں مبتلا مریض دکھائے ہیں، وہیں دوسری طرف ان کی امنگوں اور ان کی چارہ گری کرنے کے لیے ایک دردمند اور احساس کرنے والے ڈاکٹر کو بھی ناول کا حصہ بنایا۔ لیکن نشاط فاطمہ کے ناول کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ حوصلہ مند ڈاکٹر نا صرف انگریز ہے بلکہ اس کے اباؤ اجداد ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے ہندوستان میں نو آبادکاری کا آغاز کیا۔ ایسے لوگ جنھوں نے ہندوستانیوں سے ان کا وطن، حقوق، سیاسی و معاشی باگ دوڑ چھین لی تھی اسی نسل کا ایک نو آبادکار اب ہندوستان کے لوگوں کے زخموں کا مسیحا بن رہا ہے۔نشاط فاطمہ کے ناول کے سماج میں اچھا انسان خواہ کسی بھی ذات سے ہو کسی بھی ملک سے ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق اگر پڑتا ہے تو اس کے اعمال سے اس کی نیت اور کارکردگی سے۔ڈاکٹر ایڈورڈ جو کہ برطانیہ سے کوڑھ پر سرجری پڑھ کر ہندوستان آیا تھا، اس کا تبادلہ یہاں سے بنگلادیش میں ہو گیا کیوں کہ اس وقت تک کوڑھ کا کوئی بھی ڈاکٹر نہیں تھا۔اور بنگلہدیش کوڑھیوں سے بھر چکا تھا۔ ایڈورڈ ہسپتال میں داخل ہونے سے پہلے اپنے خدا سے بہت دل سے دعا کرتا ہے کہ وہ جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہے رب اسے اس میں کامیاب کرے۔ دردانسانیت رکھنے والے اس ڈاکٹر نے ہسپتال میں آتے ہی بہت سی تبدیلیاں کیں۔وہ راہب یا راہبائیں جو کوڑھ زدہ مریضوں کے ساتھ برا سلوک روا رکھتی تھیں ان سے بہت سختی سے پیش آتا تھا جبکہ وہ راہب بھی اسی کے ملک کے تھے۔

اگر میں نے تم میں سے کبھی کسی کو ان سے بدسلوکی سے پیش آتے دیکھا تو یقین کرو وہ اس شخص کا یعنی بدسلوکی کرنے والے کا تاریک ترین دن ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ میرا کوئی مریض اس نوبت کو نہ پہنچے کا کہ خودکشی کرے۔ کوڑھی عام طور پر کوڑھ سے عاجز آکر خودکشی کر لیتے ہیں۔ مگر احتیاط رکھی جائے گی۔[18]

اس ڈاکٹر کی ایمانداری اور احساس کا یہ نتیجہ نکلا کہ کوڑھیوں کا علاج کرتے کرتے ان کو صحت یاب کرتے اور ان کو نئی زندگی دینے کے باوجود وہ ڈاکٹر خود ایک دن کوڑھ میں مبتلا ہو گیا۔ کوڑھ ہونے کے بعد بھی ڈاکٹر ہمفری اپنے مریضوں کا علاج معالجہ بھی کرتا اور ساتھ ساتھ اپنا بھی گاہے گاہے علاج کرتا رہتا ہے۔ پھر اس کا کوڑھ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ مریضوں کا علاج کرے۔ مگر حیرت تو اس بات کی تھی کہ کوڑھی زدہ ہونے کے باوجود بھی اس کو اپنے مریضوں کا خیال ہر وقت ستاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے کانوں میں آوازیں بجتی تھیں کہ جیسے کوئی درد میں رو رہا ہے۔ جبکہ وہ ان سے دور تھے، اور جب کوئی راہب جا کر اس مریض کو دیکھتا تو وہ واقعی درد کی وجہ سے رو رہا ہوتا تھا۔ سب لوگ اس بات پر حیران ہوتے تھے۔

دور کمرے میں لیٹے ڈاکٹر ہمفری کو اس بات کی خبر کیسے ہو جاتی ہے۔ ان کی تو سماعت ہی بے کار ہو چکی ہے۔[19]

"آنسو جو بہہ نہ سکے" کے مذہبی موضوعات:

آنسو جو بہہ نہ سکے میں جہاں دیگر موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں مذہبی موضوعات بھی نشاط فاطمہ نے رقم کیے۔ ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" کا آغاز بھی مصنفہ نے ایک مذہبی واقعے سے کیا ہے، جس میں ایک کوڑھی کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کھانا کھلاتے ہیں، تو اس کوڑھی کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کو کھانا کھلانے والے ہاتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ کے نہیں ہیں، تو وہ کوڑھی حضرت ابو بکرؓ صدیق کا پوچھتا ہے ، جس پر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق وفات پا گئے ہیں۔ اس وقت وہ کوڑھی حضرت عمرؓ کو بتاتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ صدیق اس کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتے تھے جس کی وجہ سے اس کو تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ نشاط فاطمہ نے اپنے ناول میں جس معاشرے کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے یہ وہ زمانہ تھا جس میں کوڑھ ہر جگہ پھیل گیا تھی۔ کیا بڑے اور کیا بوڑھے ؟ سب اس کی لپیٹ میں تھے۔ کوڑھ جیسے موذی مرض کو نشاط فاطمہ نے موضوع بنایا ہے۔ کوڑھ جس کو جذام بھی کہتے ہیں، یہ ایک متعدی بیماری ہے جو ایک سے دوسرے کو آسانی سے منتقل ہو جاتی ہے۔ جسے عام الفاظ میں چھوت کی بیماری بھی کہا جاتا ہے۔ کوڑھ میں جسم گلنا شروع کر دیتا ہے اور زخموں میں پیپ بھر جاتی ہے۔ جس سے شدید بدبو آتی ہے۔ کوڑھ کا مریض زندگی سے قدر بے زار ہو جاتا ہے کہ وہ ہر پل ایک ہی دعا کرتا ہے کہ یا تو ان کے زخموں کا علاج ہو جائے یا وہ ان

زخموں کی تکلیف سے تنگ آکر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ کیوں کہ کوڑھ کی بیماری انسانی ذہن میں ایک خوف کو پیدا کر دیتی ہے، جس سے مثبت سوچنے کی صلاحیت جاتی رہتی ہے۔ ویکیپیڈیا کے مطابق کوڑھ
1950-60 کی دہائی میں پاکستان خاص کر کراچی میں جذام یا کوڑھ کا مرض پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ مرض لا علاج سمجھا جاتا تھا۔ مذہبی طبقے نے بھی اسے اللہ کا عذاب قرار دے دیا۔ چناں چہ جس انسان کو کوڑھ کا مرض لاحق ہو جاتا، اسے شہر سے باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ اور وہ ویرانوں میں سسک سسک کر دم توڑ دیتا تھا۔[20]

ایسے میں ایک جرمن ڈاکٹر روتھ فاؤ جنھوں نے ایک ٹی۔وی پروگرام میں کوڑھ کے حوالے سے پاکستان کے حالات دیکھے۔ اس فلم میں دکھایا گیا تھا کہ کوڑھ کی بیماری لگنے کے بعد کس طرح انسان کا جسم گلتا ہے اور گوشت ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتا ہے۔ کوڑھ کا اس وقت تک کوئی علاج سامنے نہ آیا تھا۔ خصوصاً کراچی جیسے بڑی آبادی والے شہر میں یہ مرض روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر روتھ جو کہ ایشیا کی بڑی ڈاکٹروں میں شمار ہوتی ہیں، انھوں نے برطانیہ کی رنگ برنگی زندگی چھوڑ کر کراچی کا رُخ کیا۔ اور یہاں کے لوگوں کی حالت دیکھنے کے بعد واپسی کا ارادہ منسوخ کر کے مستقل پاکستان میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ یہاں انھوں نے 1963 میں کوڑھ کے لیے چھوٹے چھوٹے کلینک کھولے، جن میں نہ صرف پاکستان کے بلکہ ارد گرد کے ممالک سے بھی مریضوں کو لایا گیا۔ اور ان کا علاج کیا۔ 1996 تک ڈاکٹر روتھ فاؤ اور ان کے ساتھ کام کرنے والے دیگر ڈاکٹروں کے ہمراہ پاکستان ایشیا کے ان ممالک کی فہرست میں شمار ہو گیا جو جذام کے مرض پر قابو پا چکے تھے۔

نشاط فاطمہ نے اپنے ناول میں کوڑھ کی بیماری کے اس دور کا ذکر کیا جس میں اس کو لا علاج سمجھا جاتا تھا۔ لوگ خدا سے رو رو کر فریاد کرتے کہ ان کے زخموں کے لیے کوئی چارہ گر بھیج دے۔ ناول میں انھوں نے ایک کردار کے ذریعے ایک کوڑھی زدہ انسان کو جو درد اور تکلیف برداشت کرتے کرتے بے بسی کی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ایک امید ہے جو اس کے اندر زندہ ہے۔ نشاط فاطمہ نے اس امید کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ جس میں فرانسس نام کا ایک عیسائی جو کہ کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہے اور کوڑھ کی بیماری نے اس کو اندر سے اس قدر کھوکھلا کر چکی ہے کہ وہ ناامید ہو چکا ہے مگر اس کے باوجود بھی ایک یقین اس کے اندر ہنوز قائم ہے کہ کوئی تو مسیحا آئے گا جو اس کی یا اس کے بعد آنے والوں کی مسیحائی کرے گا۔

فرانسس نے جوزف سے کہا " میں نے رات ایک خواب دیکھا اور اس کے آنے کی بشارت لی۔ میں نے دیکھا وہ ڈھاکے میں ہے اور تم مجھے نوکے میں بٹھا کے لیجا رہے ہو اور وہ صورت شکل میں ہمارے بڑے پادری صاحب سے بھی اچھا ہے۔[21]

نشاط فاطمہ نے اپنے اس ناول آنسو جو بہہ نہ سکے میں اپنے کرداروں کی اس امید کو ٹوٹنے نہیں دیا بلکہ اس امید کو ڈاکٹر ہمفری کی صورت میں حقیقت کی شکل میں ناول میں شامل کیا ہے۔ جو نہ صرف ایک کوڑھ کا ایک ماہر سرجن ہے بلکہ ایک درد دل رکھنے والا نیک سیرت انسان ہے جو مریض کو مریض سمجھ کر علاج کرتا ہے نہ کہ اس کے ہندو، مسلم یا عیسائی ہونے سے۔ وہ ایک عیسائی سرجن ہے جو مذہب سے دور ہے مگر جب وہ کوڑھ کے ماہر سرجن ہونے کی حیثیت سے بنگال کے ہسپتال میں کوڑھیوں کا علاج کرنے آتا ہے تو وہ خداوند سے خصوصی دعا کرتا ہے۔ اے خدا مجھے سرخ رو کر، تاکہ میں اپنے آپ سے شرمسار نہ ہوں۔ اے خدا مجھے ثابت قدم رکھیو۔ اور میرے یقین کو متزلزل نہ کیجیو۔[22]

اس یقین اور اعتماد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر ہمفری نے اپنی تمام زندگی کوڑھیوں کے لیے وقف کر دی۔ جب ڈاکٹر ہمفری بطور سرجن ہسپتال میں آیا تو وہاں کے مریض ہوں یا راہب سب ڈاکٹر ہمفری کو "ڈاکٹر" مخاطب کرنے کی بجائے "فادر صاحب" کہتے تھے۔ فادر عیسائیوں کے ہاں چرچ میں دعا اور عبادت کروانے والے کو کہتے ہیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر ہمفری جو بچپن سے لے کر اب تک جوانی میں قدم رکھنے کے باوجود بھی عبادت اور مذہب سے کوسوں دور انسانیت کی خدمات کرنے کے لیے دن و رات ایک کر رہا ہے۔ اب اپنے مریضوں کے منھ سے اپنے لیے "فادر صاحب" کا لفظ سننا اس کو ایک عجیب خیال میں لے گیا ہے۔

اور یوں بغیر راہب بنے فادر کہلانے لگا۔ باہر نکل کے اس نے سوچا" ساری عمر مُجھے پادریوں سے نفرت رہی اور خود ہی پادری کہلانے لگا۔ اچھا۔"[23]

انسانیت اور مذہب کہنے کو تو دو مختلف چیزیں ہیں۔ مگر ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کی اساس انسانیت پر ہے۔ مذہب بذاتِ خود اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ انسانیت کے ساتھ مذہب کا تعلق ہے۔ مذہب کو اگر انسانیت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو اس کا وجود معمولی ہے۔ اس

میں ایک نقطہ اور بھی ہے کہ انسانیت کے لیے کسی مذہب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ مثلاً بہت سے ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جو لادین ہیں مگر ان میں انسانیت کی خدمت کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ کیوں کہ انسانیت مذہبی جذبات سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ یہ رنگ، نسل، قوم کے فرق کو نہیں دیکھتی۔ انسان اور جانور میں بھی ایک ذرہ سا فرق ہوتا ہے جس کی بدولت ان دونوں میں تفریق کی جاسکتی ہے اور وہ فرق انسانیت کا ہے۔ انسان کے اندر یہ ایک وصف ہے جس کی وجہ سے اس کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اسی کی وجہ سے انسان اور حیوان میں تمیز کرنا ممکن ہو پاتی ہے۔ اگر انسان کے اندر سے انسانیت نکل جائے تو وہ انسان "انسان" نہیں رہتا۔ بلکہ وہ تو انسانیت کے درجے سے بھی نکل جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسانیت کیسے اور کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے؟ انسان کے اندر انسانیت اس کے نیک اعمال اور اچھی سوچ اور نیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان کی سوچ مثبت ہو گی تو اس کے اندر اچھے اعمال کرنے کا جذبہ پیدا ہو گا اور اچھے اعمال کا تعلق کسی ایک خاص مذہب یا قوم سے نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کا سارا دارومدار انسانیت پر ہے۔ ڈاکٹر ہمفری کی سوچ مذہب کے حوالے سے شروع سے ہی مختلف رہی ہے۔ وہ مذہب میں انسانیت کی خدمت کو زیادہ اہم گردانتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ خدا کسی ایک جگہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر کونے میں خدا ہے۔ ہسپتال کے ایک ملازم فرانسس کے استفسار پر کہ ڈاکٹر ہمفری عیسائی ہوتے ہوئے بھی گرجا گھر باقاعدگی سے کیوں نہیں جاتے۔

> پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے فادر کیوں کہتے ہو؟ میں تمہیں فادر نظر آتا ہوں؟ فادر ایسے کپڑے پہنتے ہیں؟ میں تو ڈاکٹر ہوں بھائی۔ اور رہا گرجے کا تو فرانسس، خدا ہے اور ہر جگہ ہے۔ وہ گرجے میں تو نہیں بیٹھا رہتا۔ ساری دنیا گرجا ہے۔ کیوں کہ وہ ہر جگہ ہے۔ اور خدا کو کچھ نہیں چاہیے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اپنے لیے۔[24]

چلتا مسافر کے عمومی موضوعات (سیاسی، سماجی، مذہبی)

الطاف فاطمہ کے ناول "چلتا مسافر" کو اردو ادب میں خاص مقبولیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اس ناول میں انھوں نے تقسیم کی دو داستانوں کا قصہ بیان کیا ہے۔ جو نہ صرف دل خراش واقعات سے مزین ہیں بلکہ کرب اور دکھ کی داستان کو الطاف فاطمہ نے رقم کیا ہے۔ اپنے اس ناول میں انھوں نے 1940 سے لے کر

1970 تک کے واقعات کو زیرِ قلم کیا۔ جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ بے گھر ہوئے، لوگوں نے اپنی بہو بیٹیوں کی عزتوں کی پامالی ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس ناول میں الطاف فاطمہ نے ایسے کردار تخلیق کیے جنھوں نے تقسیمِ پاکستان ہونے کے نتیجے میں یہ دل خراش واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور حد تو یہ ہے کہ 1947 میں اتنا ظلم اور بربریت دیکھنے کے بعد انھوں نے سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کو بھی نہ صرف دیکھا بلکہ ان کا شکار بھی ہوئے۔

الطاف فاطمہ کا ناول ایک المیہ ناول ہے جس میں انھوں نے عالمانہ انداز میں تمام تر فسادات اور واقعات کو بیان کیا۔ انھوں نے اپنے ناول چلتا مسافر میں بہاری کرداروں کے ساتھ ہونے والے مظالم کو اس طرح پیش کیا گویا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھتی تھیں۔ الطاف فاطمہ نے اس ناول میں ایک ایسے بہاری خاندان کی کہانی پیش کی۔ جن کا تعلق برصغیر کے ایک زمیندار اور اشرافیہ گھرانے سے تھا۔ لیکن زمیندار ہونے کے باوجود انھوں نے الگ وطن کے حصول کے لیے جدوجہد کی۔ سید مبشر کا کردار جو نہ صرف گھر کا سربراہ تھا بلکہ مسلم لیگ کا سرگرم کارکن بھی تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا فسادات کی نظر ہو گیا۔ اور چھوٹا اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے حصول کے لیے لڑا اور بالآخر انھوں نے الگ وطن حاصل کر لیا۔ اس ناول کی مقبولیت کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس خاندان نے ہجرت کے دو واقعات ہوتے دیکھے۔ پہلی ہجرت 1947 میں ہندوستان سے مشرقی پاکستان یعنی بنگال میں کی۔ جبکہ دوسری ہجرت 1971 میں بنگلادیش سے پاکستان میں کی۔ اس دوران ہونے والے تمام تر واقعات نے ان کو نفسیاتی، سیاسی اور سماجی طور پر متاثر کیا۔ الطاف فاطمہ نے ان تمام تر واقعات کو تفصیل سے اپنے ناول میں پیش کیا۔

چلتا مسافر کے سیاسی موضوعات

کسی بھی کہانی کا موضوع بالواسطہ یا بلاواسطہ اصل زندگی سے ہوتا ہے۔ جو خیال یا مسائل مصنف بیان کرنا چاہتا ہے وہی کہانی کا موضوع بن جاتا ہے۔ اس میں کسی انسان کے اندرونی خیالات، فکر، احساس اور مشاہدات تمام کو موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ جس سے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے

مسائل، پریشانیوں اور نفسیاتی الجھنوں کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ بر صغیر کی تقسیم کا واقعہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے نہ صرف خواتین، بڑے، بوڑھوں پر اثرات مرتب کیے بلکہ چھوٹے بچوں کے ذہنوں کو بھی متاثر کیا۔ اور چوں کہ ادب ہمارے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے چناں چہ ارد گرد جو کوئی بھی واقعات رونما ہو رہے ہوں گے ان کا اثر ادیب پر بھی پڑتا ہے۔ بر صغیر کے الگ ہونے کا اثر ادب اور ادیب دونوں پر یکساں پڑا۔ جس کے باعث بہت سے موضوعات اردو ادب کا حصہ بنے۔ ہندو مسلم چپقلش، الگ وطن کے حصول کے لیے کوشش، فسادات، جنگِ آزادی، ہجرت کے مسائل اور اپنوں کو کھونے کا غم "قیامِ پاکستان" کے ایسے موضوعات ہیں جن کا اثر مصنفینِ ادب پر پڑا اور کم و بیش تقریباً تمام ادیبوں اور مصنفین نے اس پر قلم اٹھایا۔ فسادات کے حوالے سے انتظار حسین کہتے ہیں:

> تقسیم کا اثر ہمارے ذہنوں پر بہت پڑا ہے۔ سماجی فضا اور سیاسی ماحول یک لخت بدل گیا۔ انگریزوں کا اثر ضرور رہا لیکن انگریز حاکم سامنے سے ہٹ گئے۔۔۔ ادھر ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب قومی حکومت سے پہلے ہندو مسلم اور سکھ اکٹھے رہتے تھے۔[25]

بر صغیر کی تقسیم نے صرف دو قوموں کو ہی الگ نہیں کیا بلکہ دو ثقافتوں کو بھی الگ کر دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے لکھنے والوں نے اپنے ناولوں میں ان تمام فسادات اور ستم کاریوں کا ذکر کیا جو کہ اس دور کے لوگوں نے برداشت کیں۔ جب کسی ملک میں جنگ ہوتی ہے تو اس ملک کے حالات بدل جاتے ہیں۔ اس طرح فسادات اور ہجرت نے ادیبوں کی فکری صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ الطاف فاطمہ نے بھی فسادات اور ہجرت کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ ان کا ناول "چلتا مسافر" ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ انھوں نے اپنے ناول میں 1947 سے پہلے اور بعد کے حالات کی منظر کشی کی ہے۔ کہ کس طرح پاکستان کے حصول کے لیے لوگوں کو اپنی جان، مال اور اپنے پیاروں کو قربان کرنا پڑا۔ اور یہ سلسلہ پاکستان بننے کے بعد بھی نہیں رکا، بلکہ متواتر جاری رہا۔ الطاف فاطمہ اپنے ناول میں ہندو مسلم فسادات کی پہلی وجہ یعنی "مذہب" کو نو تاریخی بیان میں پیش کیا۔ کہ کس طرح مسلمان عید قرباں پر جانوروں کی قربانی کے ساتھ خود بھی قربان ہو جاتے تھے۔ چوں کہ مسلمان سنتِ ابراہیمی کے تحت گائے کی قربانی کرتے تھے۔ اور ہندو اسی گائے کی پوجا کرتے تھے۔ اس لیے ہر عیدِ قرباں پر خونی فسادات ہوتے تھے۔

قربانی کی گائے پر چھری چلانے والوں پر بستی کے ہندوؤں نے حملہ کر دیا۔ یہ خبر تو نماز کے بعد ہی سننے میں آگئی تھی اور گھر بیٹھی عورتوں نے اپنے اپنے بچوں کو اپنی اپنی دھوتیوں کے پلوؤں میں چھپا کر گھروں کی کنڈیاں لگالی تھیں۔ آنے ولے خطروں کے خوف سے ان کے سانولے چہرے پیلے ہونے لگے تھے۔[26]

در اصل ہندو اور مسلم کے درمیان فسادات اور ابتدائی تصادم مذہب کی بنا پر ہی سامنے آیا۔ اس کے بعد تہذیب اور ثقافت آتے ہیں۔ مغلیہ دور کے زوال کے بعد مسلمانوں کو بھی زوال آگیا۔ جس سے مسلمانوں کا عہدِ زریں ختم ہوا۔ نو آبادکاروں کی آمد سے سیاسی، سماجی، معاشی، لسانی، مذہبی اور تہذیبی مسائل کھل کر سامنے آنے لگے۔ جس سے مسلمانوں میں یہ احساس بیدار ہوا کہ وہ ہندوؤں سے یکسر مختلف ہیں۔ دو مذاہب اور دو تہذیبیں کس طرح ایک ملک میں آزادانہ زندگی گزار سکتی ہیں۔ ہندوؤں میں صدیوں سے دبی ہوئی نفرت اب آہستہ آہستہ سامنے آنے لگی۔ اس سب کا انگریز حکومت نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے لگ گئے۔ لیکن مسلمانوں نے انتھک محنت اور حوصلہ مندی سے 1947 میں اپنا الگ ملک حاصل کر لیا۔ اور اس ملک کے حصول کے لیے انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ تقسیم سے پہلے فسادات کے نتیجے میں جو انسانی قتل وخون ہوا اور وہ تمام تر مسائل جو نقل مکانی کرنے کے نتیجے میں لوگوں کو ہوئے، ان تمام کا اثر مختلف ادیبوں پر مختلف ہوا۔ کسی نے اسے سیاسی طور پر دیکھا تو کسی نے نفسیاتی اعتبار سے۔ لیکن الطاف فاطمہ نے ہر پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے اس ناول کی تخلیق کی۔ کیوں کہ ادیب یا مصنف خواہ کوئی بھی ہو اور کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو، وہ ہر طرح کے فرقہ وارانہ تعصب سے پاک ہوتا ہے۔ وہ ہر انسان کو "انسانیت" کی نظر سے ہی دیکھتا ہے۔ خواہ وہ ہندو مسلم، سکھ یا عیسائی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے دل میں انسانی ہمدردی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ چناں چہ وہ اپنے خیالات اور احساسات کو لکھ کر اپنا تزکیہ کر لیتا ہے۔ کیوں کہ ادیب کا نقطہ نظر ہمیشہ عمومی لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اور اسی طرح وہ مختلف انداز میں اپنے غیر معمولی محسوسات کو لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریچہ کے خیال میں:

فسادات پر لکھنے والے ادیبوں کا جذباتی رد عمل ایک سانہ تھا۔ سیاسی، معاشرتی اور معاشی انقلاب نے مختلف طرح کا در عمل مختلف ادیبوں سے کروایا۔ کئی ادیبوں نے فسادات کی

لکھیرنی تصویر پیش کی، کئی ادیبوں نے تخلیل سے رنگ آمیزی کی، کئی نے اسباب و علل کے حوالے سے بات کی۔ بعض ادیبوں نے فسادات کے بعد زندگی پر لکھا۔ اکثر ادیبوں کے ناولوں میں فسادات کی تصویر کشی کرتے ہوئے جذبات کی شدت ملی۔[27]

مسلمانوں میں آزادی کی تحریک چلنے کے ساتھ ہی انھوں نے مذہبی اور ثقافتی اعتبار سے اپنی الگ پہچان کا اعلان کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہندو بھی اپنے مذہب کو لے کر حساس ہو گئے۔ جس کی وجہ سے اختلاف بڑھنے لگے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی آزادی کی تحریک میں نہ صرف ہندوؤں نے مخالفت کی بلکہ کچھ مسلمان بھی ایسے تھے جن کو اس بات پر یقین نہیں تھا کہ مسلمان الگ ملک بنانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ چلتا مسافر میں الطاف فاطمہ نے نو تاریخی بیان کے ذریعے اسی بات کو واضح کیا ہے۔ جب سید مبشر اپنی بیگم کے ساتھ بحث کے دوران حد درجہ جذباتی ہو جاتے ہیں۔

پانچ سال پہلے میری قوم نے جو خواب دیکھا تھا وہ حقیقت میں ڈھل رہا ہے۔ اور ڈھل کر رہے گا، تم کہتی ہو میں ایسی باتیں نہ کیا کروں۔ لیکن بیگم، اگر تم بھی لاہور کے اس اجتماع میں موجود ہوتی تو تم اس خواب کو فراموش نہ کرتی۔ جناح صاحب کے چہرے کا وہ سکون، وہ عزم اور ہر صوبے کے مسلمانوں کے وہ جوش اور سب سے زیادہ ولولہ انگیز لمحات شیر بنگال نے آکر قرادادر پاکستان پیش کی۔[28]

ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو اپنے الگ وطن کے حصول کے لیے بہت سی تکلیفوں سے گزرنا پڑا۔ قیام پاکستان سے پہلے جو فسادات وقوع ہوئے اس نے لوگوں کے ذہنوں پر برے اثرات مرتب کیے۔ ہر طرف فسادات، دنگے، لڑائی جھگڑا، خون خرابے کی فضا قائم ہو گئی۔ ناول میں جابجا الطاف فاطمہ نے فسادات کی ایسی منظر کشی کی، جس کی مثال کسی دوسرے ناول میں کم ہی ملتی ہے۔ ناول میں مرکزی کردار "مزمل" ایک مرتبہ اپنے والد کے ساتھ کمشنر کی میٹنگ سے واپس آرہا ہوتا ہے اور واپسی پر وہ علاقہ جس میں فساد کے بعد کی صورت حال کو دیکھا یا گیا ہے۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں ہیں، تدفین کے مسائل اور لواحقین کی آہ و فریاد کا ایسا دل خراش منظر ہے جس سے مزمل کا ذہن متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور وہ کئی روز تک اس منظر کو آنکھوں سے نہ ہٹا پایا۔

جلے ہوئے جھونپڑے، سنسان راستے اور افسردہ مکانوں کی بند کنڈیوں نے علاقے کا جائزہ لینے والوں کا استقبال کیا تھا، اور جب باہمی بات چیت کے لیے دونوں فریقین (ہندو مسلم) آپس میں مل جل کر بیٹھتے تو سرخ شعلہ بار آنکھیں اور ضبط کی کوشش میں بار بار چبائے جانے والے ہونٹوں نے مزمل کو سخت بے چین کیا تھا۔[29]

مزمل کے وہاں سے واپس آنے کے بعد ان تمام حادثات کا اس پر بہت گہرا اثر پڑا۔ وہ کئی دن تک اس واقعے کو بھلا نہیں سکا۔ چناں چہ اس سب نے اس کو زندگی کے اصل معنی سمجھا دیے۔ اس کے دل میں لوگوں کے لیے پہلے سے زیادہ محبت اور احساس کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ اب زندگی کے نئے مطالب سے آگاہ ہو گیا تھا۔ ملکی حالات کی وجہ سے ناول میں جابجا تناؤ کا ماحول دیکھنے کو ملتا ہے۔ نو تاریخیت نے قاری کی نہ صرف سوچ کو وسعت دی بلکہ اس کی مدد سے قاری کو باریک بینی سے تاریخ کو جاننے کا موقع بھی ملا۔ نو تاریخیت کی بدولت آج کا قاری اس دور کے واقعات اور لوگوں کی نفسیاتی کشمکش کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔

گھر کی چھوٹی بیٹی شادی کر کے امرتسر چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلنے والی اور آزادی کی خاطر ڈٹ کر کھڑے ہونے والوں میں شمار ہوتی تھی۔ امرتسر میں حالات خراب ہونے کے بعد اس کے تمام سسرال والوں نے اس پر زور دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے وہ اپنے میکے چلی جائے کہ جب تک حالات واپس ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ لیکن اس نے ان کی ایک نہیں مانی اور شوہر کے ساتھ امرتسر ہی رہی، جہاں آئے دن فساد، قتل و خون اور عزتوں کی پامالی ہوتی ہے۔ زہرہ نے بہت ہمت اور حوصلے کے ساتھ اس کٹھن وقت کو گزارا۔ لیکن ارد گرد کا ماحول اور حادثات انسان کے ذہن پر بہت برے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اور ان سب کا اثر زہرہ پر بھی ہوا۔ اس کی نفسیاتی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔

کچھ عجیب طرح وقت گزر رہا ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ پاکستان کی حد بندی کی کیا صورت ہو گی۔ اور اسی وجہ سے شہر کی فضا میں تناؤ سا آ گیا ہے۔ پورا ماحول جیسے بھڑوں کا چھتا بن گیا ہے۔ دونوں طرف گھروں میں اسلحہ رکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔[30]

کسی بھی ملک میں جنگ بندی کی صورت حال چل رہی ہو اور اس کے نتیجے میں جو فسادات ہوتے ہیں وہ خواہ کم وقت کے لیے ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ معاشرے پر دوررس اثرات مرتب کرتے ہیں۔ فسادات نے انسانی ذہن اور اس کی نفسیات کو کافی حد تک متاثر کیا۔ لیکن فسادات کے بعد ہجرت ایک ایسا موضوع ہے جس نے ہر خاص وعام، چھوٹے بڑے، ادیب اور عام عوام کو متاثر کیا۔ غرض یہ کہ تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ہجرت کے نتیجے میں ہونے والے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ ہجرت کے دوران اپنوں کو چھوڑ جانے کا غم، بھوک، افلاس، فاقے، عورتوں کا اغوا اور اپنے گھروں اور پرانی یادوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے خاک ہوتے دیکھنا ایک دشوار عمل ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انوار احمد رقم طراز ہیں۔

> اردو افسانے میں فسادات کے ساتھ ساتھ "ہجرت" کا موضوع بھی اپنا خراج وصول کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ محض ماضی سے متعلق جذباتی رویے کا عکس نہ رہا اور نہ ہی بچھڑنے والے تہواروں، گلی کوچوں۔ باغوں پرندوں اور لوگوں کی کشش میں اسیر رہنے کا کرشمہ رہا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ایک پیچیدہ نفسیاتی رجحان بنتا گیا اور یہ بھی کہ نئے ماحول سے تہذیبی و ثقافتی موافقت پیدا نہ ہو سکنے کے نفسیاتی اسباب بھی ہوں گئے۔ مگر اس کی وجوہات سیاسی اور سماجی بھی ہیں۔[31]

الطاف فاطمہ کے ناول "چلتا مسافر" میں ہجرت کے "دو" اندوہ ناک واقعات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ناول میں ہر انسان سیاسی و سماجی سطح پر ذہنی انتشار کا شکار نظر آتا ہے۔ اپنے اور غیروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے خون میں لت پت دیکھنا، اپنے آباد گھروں کو اجڑتے دیکھنا اور نفسیاتی مسائل کا بیان اس ناول میں شامل ہے۔ الطاف فاطمہ نے جس تفصیل کے ساتھ فسادات اور ہجرت کی داستان اپنے ناول میں پیش کی ہے۔ اس ناول کی مثال خال ہی کسی دوسرے ناول میں نظر آتی ہے۔ مگر اس کے باوجود سوال یہ ہے کہ الطاف فاطمہ نے فسادات کی کہانی کو کیسے باریک ترین تجربے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تو یہ کہنا ہر گز غلط نہ ہو گا کہ الطاف فاطمہ بذاتِ خود ہجرت کے تجربے سے دوچار ہوئیں۔ بلکہ انھوں نے ان تمام تر مسائل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ چناں چہ ان کے ناولوں میں ہجرت، سفر کی دشواریاں، صعوبتیں اور مسائل نظر آئے ہیں۔ ہجرت کے نتیجے میں الطاف فاطمہ کے ناول میں بہت گہرائی اور مکمل معنی کا بیان ملتا ہے۔ ہجرت کے پسِ منظر میں لکھے

جانے والے ناول کو الطاف فاطمہ نے بیس سال کے عرصے میں مکمل کیا ہے۔ اس ناول کو الطاف فاطمہ نے باریک مشاہدے، مکمل اور جامع انداز میں قارئین کی نظر کیا۔ ان کے ناول میں ہجرت کرنے والے کے احساسات اور ہجرت کرنے والی نئی نسل کے جذبات اور محسوسات کو حقیقت پسندی سے پیش کیا ہے۔ ناول میں بھی ہجرت کے نتیجے میں لوگوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر جوں جوں وقت قریب آتا گیا اور بالآخر پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ تو ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ شہزاد (زہرہ کا شوہر) اپنے چاچا سے فون پر بات کر کے بہت پر جوش تھا۔ کیوں کہ اس کے چچا پاکستان سے اس کو فون کر رہے تھے۔ لیکن زہرہ خوش ہونے کے ساتھ افسردہ بھی ہو گئی۔ کیوں کہ امرتسر پاکستان کے حصے میں نہیں آیا۔ بلکہ ہندوستان سے ہی ملحق رہا۔ آزادی کے بعد ہجرت کا دور جب شروع ہوا اس وقت بھی ہجرت آسانی سے نہیں ہوئی بلکہ ہندوؤں اور سکھوں نے مل کر مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایسے میں جہاں کچھ لوگ پاکستان ہجرت کر کے پہنچ جاتے تو کئی لوگ راستے میں ہی شدت پسند ہندوؤں کے ظلم کا شکار ہو جاتے۔ پاکستان کو اچھی طرح سے استقبال کرنے کے لیے سید مبشر صاحب نے اپنی بیٹی زہرہ کی صورت میں اپنے گھر کا جو فرد بھیجا وہ بھی پاکستان کے بننے کی خوشی نہ منا سکا۔ بلکہ فسادات کی نظر ہو کر اپنی جان گنوا بیٹھا۔

دوسری طرف پاکستان کی آزادی کے بعد سید مزمل اپنی بھابھی جو کہ بھائی کی وفات کے بعد اب ان کی بیوی بن گئیں تھیں، اپنے تین بچوں اور ماں کے ہمراہ مشرقی پاکستان پہنچ جاتا ہے۔ ان کا بھارت سے مشرقی پاکستان کا سفر آسان نہیں تھا۔ ان کو بھی دوسروں کی طرح جابجا پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر اس سب کے باوجود آخر کار وہ مشرقی پاکستان پہنچ گئے۔ ان کو یہاں آتے ہی ایک گھر دے دیا گیا۔ کیوں کہ یہاں پر کچھ لوگ اس بات سے واقف تھے کہ وہ نہ صرف سید مبشر کا بیٹا ہے بلکہ مسلم لیگ کا سرگرم کارکن بھی رہ چکا ہے۔

> محکمہ بحالیات کا دیا ہوا وہ چھوٹا سا پُرزاہ، جس کے تحت گھنشیام کے اس متروکہ مکان کا تالا توڑ کر چھت تلے بیٹھا تھا۔ اور وہ تو یہ پُرزا بھی نہ ملتا جو مسلم لیگ کے بعض کارکن اس کو پہچان نہ لیتے کہ وہ سید صاحب کا لڑکا ہے۔ نہ کس نے اس کی داستان پوچھی، نہ سنانے کو

اس کے لب ہلے۔ بات یہ ہے کہ یہاں داستانیں ہی داستانیں اور قصے ہی قصے تھے۔ اور
جب تالا ٹوٹا تو سارا کنبہ چپ چاپ کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔[32]

لیکن صد افسوس کہ پریشانیوں نے یہاں بھی اس خاندان کو آن گھیرا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی سیاست، جغرافیائی فاصلہ اور لسانی مسئلے نے مشرقی پاکستان میں رہنے والے بہاریوں کے لیے پھر سے زمین تنگ کرنا شروع کر دی۔ اور فسادات کا وہ خونی کھیل جو 1947 کو مزمل کے خاندان کو دیکھنا پڑا وہ اب پھر سے آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ ایسے میں سیاسی جماعتوں کے کارکن جو کہ طلبا تنظیم کی مدد سے شر پھیلا رہے تھے، وقت کے ساتھ ساتھ بہاریوں پر ظلم اور بربریت کے پہاڑ توڑنے لگے۔ انھوں نے جو سیاسی کھیل کھیلا وہ یہ تھا کہ انھوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بنگالی طالب علموں کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے زیر تسلط ہے۔ جبکہ مشرقی پاکستان الگ سے ایک مملکت کی حیثیت رکھتا ہے۔ چناں چہ طالب علموں کی مدد سے بہاری خاندانوں، بہاری طالب علموں اور بہاری افسروں کو مختلف ذرائع سے عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔ الطاف فاطمہ نے اپنے ناول میں بھی ایک جگہ لکھا ہے۔ "ہمارے زمانے میں تعلیم گاہوں میں علم نہیں سیاست پڑھائی جاتی ہے۔[33]

ایک اور جگہ پر وہ لکھتی ہیں۔

پروفیسر سیاست کرتے ہیں۔ طالب علم سیاست کرتے ہیں۔ تعلیم کا ماحول نہیں ۔
یونیورسٹی سیاست، نفرت اور عداوت کا گڑھ بنتی جارہی ہے۔ نفرت کرنا فیشن بنتا جاتا
ہے۔[34]

1965 کے بعد حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ بنگالیوں نے بہاریوں کے ساتھ فاصلہ اختیار کر لیا۔ اسی دور میں بہت سے واقعات ہوئے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ ریلی، مجیب الرحمٰن کی سیاسی پالیسیاں اور تلا سازش کیس جیسے واقعات نے لوگوں کے درمیان ایک سرد سی دیوار حائل کر دی تھی۔ وہیں دوسری طرف مغربی پاکستان میں مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والے لوگ اس قدر حیران تھے کہ پاکستان کے ایک ٹکڑے میں خون ریزی اور قیامت کا سماں ہے۔ جبکہ مغربی پاکستان کے لوگ ایسے زندگی بسر کر رہے ہیں جیسے

کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ ہر طرف مکمل سکون اور رونق سی ہے۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں کتنا سکون ہے! کتنی راحت ہے! لیکن وہ۔۔۔ وہ کیا تھا۔ سب؟ جیسے کسی نے برا سا خواب دیکھا ہو۔[35]

الطاف فاطمہ کا ناول "چلتا مسافر" سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھا جانے والا ناول ہے۔ یہاں بھی الطاف فاطمہ نے تقسیم کے پہلے اور بعد رونما ہونے والے فسادات کا ذکر کیا۔ 1947 کی جنگ آزادی میں ہجرت اور فسادات دیکھنے کے بعد ان کے حصے میں 1971 میں بھی اس سے مختلف صورت حال ہر گز نہ تھی۔ لاشیں کیڑے مکوڑوں کی طرح سڑتی رہیں۔ یا ان کو کتے نوچ کر کھا جاتے۔ ڈاکٹر رانیہ آکاش اس ناول کے حوالے سے اپنے کالم میں لکھتی ہیں۔

> الطاف فاطمہ کے ناول "چلتا مسافر" کو سقوطِ ڈھاکہ پر لکھے جانے والے ادب میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ ناول اپنی ابتدا سے انتہا تک معاشرتی و سیاسی چیرا دستیوں اور انسانی استحصال کے دوہرے رویوں پر مبنی جھوٹی سیاست کے اصل چہرے بے نقاب کرنے کی ایک کاوش ہے۔ ناول میں بیان کیے گئے حقائق قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جغرافیائی بعد اور حکمرانوں کی غفلت کے باعث جس بد نظامی اور انتشار کا سامنا عوام الناس کو کرنا پڑا۔ اور جنگ کے نتیجے میں جو خون خرابا اور پکڑ دھکڑ ہوئی، مصنفہ اس کا ذمہ دار اس دھڑے کو ٹھہراتی ہے جس نے شروع سے پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کیے رکھا۔[36]

چلتا مسافر کے سماجی موضوعات:

الطاف فاطمہ نے سیاسی موضوعات کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل کو بھی موضوع بنایا۔ انھوں نے سماجی رویے، طبقاتی کشمکش، نفسیاتی الجھنوں اور ملکی حالات کے پیشِ نظر ہونے والے واقعات کا اپنے ناول میں تفصیل سے ذکر کیا۔ الطاف فاطمہ کے ناول "چلتا مسافر" میں تاریخ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس دور کے سماج کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس میں فسادات کے نتیجے میں لوگ مختلف قسم کے ذہنی تناؤ میں تھے۔ اور اس تناؤ نے انسان کی نفسیات اور روز مرہ زندگی پر کس طرح اثرات ڈالے؟ اس سب کا ذکر الطاف فاطمہ کے ناول کا موضوع رہا

ہے۔ الطاف فاطمہ نے ناول میں ایک زمیندار گھرانے کا ذکر کیا، جس نے آزادی سے سانس لینے کے لیے طرح طرح کی تکالیف برداشت کیں۔ اور انہیں اپنوں کو قربان کرنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا تکلیفوں بھرا سفر ختم نہیں ہوا بلکہ ان کے مقدر میں ایک کے بعد دوسری ہجرت بھی لکھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر زینت افشاں اس حوالے سے اپنی کتاب میں کہتی ہیں۔

> الطاف فاطمہ کا ناول "چلتا مسافر" کا موضوع صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والا خاندان اور قیامِ پاکستان کی جدوجہد ہے۔ ناول دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں قیامِ پاکستان سے پہلے کے حالات و واقعات اور اس علاقے کے لوگوں کی قربانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ دوسری فصل میں 1947 سے 1971 تک مشرقی پاکستان میں بہاریوں پر گزرنے والے حالات کا جائزہ کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے بہاریوں کے جذبات اور احساسات کی سچی تصویریں پیش کیں ہیں۔[37]

ناول میں مصنفہ نے ایسی فضا قائم کی ہے جس میں اس دور میں ہونے والے واقعات، خون خرابے کا منظر اس طرح سے پیش کیا ہے کہ قاری کو گمان ہوتا ہے کہ وہ یہ سب واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جس سے اس کو تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ روز روز کے اس خون زدہ ماحول نے انسان کی نفسیات پر کیسے اثرات ڈالے؟ ہر طرف امن اور شانتی تھی۔ پھر اچانک سے ایسا کیا ہوا جس نے برصغیر کی ہوا خون آلودہ کر دی۔

> پھر ایک دم یہ خون خرابا کیسا ہونے لگا ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس طرح آزادی کس طرح ملے گی؟ یوں تو ہم سب آپس ہی میں لڑ لڑ کر مر جائیں گیں۔ وہ سیاست آزادی کی تحریکوں اور ہر قسم کے مطالبوں سے بے زار ہو گیا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی ڈری ڈری صورتوں، بند دکانیں، سونی گلیاں، کٹے ہوئے اعضا، پھٹے ہوئے سر اور گلی کوچوں کی دیواروں پر چمکتے ہوئے خون کے چھینٹے۔ یہ سب وہ بڑی خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔[38]

فسادات نے مضبوط سے مضبوط انسان کو بھی اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ کوئی بھی فرد ہو وہ اپنی خواہش سے فسادات نہیں چاہتا۔ بلکہ حالات کے بدلنے اور لوگوں کے ملے جلے رویے اس نہج تک پہنچ جاتے ہیں کہ

فسادات برپا ہوتے ہیں۔ فسادات کی منظر کشی کرتے ہوئے الطاف فاطمہ تاریخ کے پس منظر میں، اس سماج کو قاری کے سامنے پیش کرتی ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ فسادات کے دوران شہر کے حالات کیسے ہوں گیں۔

> جلے ہوئے جھونپڑے، سنسان راستے اور افسردہ مکانوں کی بند کنڈیوں نے علاقے کا جائزہ لینے والوں کا استقبال کیا تھا، اور جب باہمی بات چیت کے لیے دونوں فریق آپس میں مل جل کر بیٹھے تو سرخ شعلہ بار آنکھیں اور ضبط کی کوشش میں بار بار چبائے جانے والے ہونٹوں نے مزمل کو سخت بے چین کیا تھا۔[39]

ہجرتِ پاکستان کے بعد بھی لوگوں کی زندگی آسان نہیں رہی۔ بلکہ مشرقی پاکستان کے بہاری مسلمانوں کو آئے دن کچھ نہ کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ کیسا سماج تھا اور کیسی تقسیم تھی جس میں پاکستان کا ایک حصہ تو اتنا خوش باش اور آزادانہ زندگی گزار رہا تھا، جبکہ دوسرا حصہ مشرقی پاکستان غربت، افلاس اور تنگ دستی کا شکار تھا۔ یہاں کے وسائل مغربی پاکستان کے استعمال میں آتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی جس کے سبب پاکستان کے دونوں بازو دولخت ہو گئے۔ اور وہ یہ تھی کہ ایک ایسا ملک جو وسائل کے اعتبار سے بہت زرخیز تھا۔ لیکن فوجی اور سیاسی مداخلت کے سبب اس ملک کے تمام تر وسائل اور مشہور پیداوار اس ملک میں استعمال نہیں ہوتی تھیں، بلکہ دوسرے حصے میں درآمد کر لی جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اس بات کا احساس شدت اختیار کر گیا کہ وہ اشیائے ضروری، جس پر مشرقی پاکستان کے لوگوں کا حق تھا۔ وہ ان کے حصے میں آنے کی بجائے کسی اور کے استعمال میں تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے دل میں عجیب سی احساسِ کمتری پیدا ہونی شروع ہو گئی اور وقت گزرے کے ساتھ ساتھ یہ احساسِ کمتری نفرت میں تبدیل ہونا شروع ہو گئی۔ جس کے سبب پاکستان دولخت ہو گیا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ اس وقت حالات ایسے ہو گئے کہ بہاری افسروں کی بیویاں جب مشرقی پاکستان سے واپس مغربی پاکستان جاتی، تو جانے سے پہلے وہ مشرقی پاکستان کی مشہور ساڑیاں اور خاص طور پر زیور خرید کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں کا پھل "ناریل" جو ذائقے اور مٹھاس میں سب سے زیادہ مشہور مانا جاتا ہے۔ اس کی بوریوں کی صورت میں اپنے ساتھ لے جاتی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ دراصل وہاں کے لوگوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بو رہی ہیں۔

میاں پر دل کا دورہ پڑا ہوا ہے اور یہ ہیں کہ اس خیال سے کہ شاید پھر کبھی یہاں آنا نہ ہو، ساریوں پر ساریاں خرید رہی ہیں۔ بوریوں میں پورے پورے ناریل اور انناس سلوار ہی ہیں۔ بس نہیں چلتا، یہاں کا سارا بید کا سامان، سارے ہاٹ بازار باندھ کر لے جائیں۔[40]

الطاف فاطمہ کا ناول "چلتا مسافر" آغاز سے اختتام تک اس دور کے معاشرے کی خرابیوں، سیاسی چیرہ دستیوں، سماجی و نفسیاتی مسائل اور انسانی استحصال کے دوغلے رویوں کی کہانی ہے جس سے جھوٹی سیاست اور سازشیں بے نقاب ہوئیں۔ یوں دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اب وہ وقت آ گیا تھا جس میں بہاریوں اور بنگالیوں کا ایک ساتھ رہنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ چوں کہ اکثریت بنگالیوں کی تھی اور بہاری نہ صرف تعداد میں کم تھے بلکہ مہاجر بھی تھے۔ اس لیے بنگالیوں کی طاقت ان سے کئی گُنا زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی اب بنگالیوں نے پکڑ پکڑ کر بہاریوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ کچھ بہاری تو اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے اور کچھ اثر و رسوخ سے مغربی پاکستان پہنچ گئے۔ لیکن کچھ بد نصیب وہ بھی تھے جن کو تقدیر نے بھاگنے کا موقع نہیں دیا اور انتہا پسند بنگالیوں کے ہاتھ لگ کر اپنی جان گنوا بیٹھے۔ سب بنگالی ایک جیسے نہیں تھے۔ کچھ لوگ ان میں مختلف بھی تھے۔ جو بنگالی ہونے کے باوجود بھی دردِ دل رکھتے تھے۔ الطاف فاطمہ نے اپنے ناول میں جس سماج کی عکاسی کی ہے، اس میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ خصوصاً انتہا پسند بھی جنھوں نے بہاریوں کے لیے زمین تنگ کر کے رکھ دی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ لوگ بھی تھے جو خود بنگالی ہونے کے باوجود بہاریوں کو اپنے بنگالی انتہا پسند بھائیوں سے نہ صرف بچا رہے تھے۔ اور ان کے لیے آرام و سکون مہیا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے میں بذلل کا کردار ہے جس نے بہاری خاندان سید زمل اور اس کے اہلِ خانہ کو نہ صرف لوگوں کی نظروں سے بچا کر رکھا ہوا تھا، بلکہ وقت وقت پر ان کو ضروریاتِ زندگی کی تمام تر اشیا بھی مہیا کرتا رہتا تھا۔

خالہ جان، کل آپ کے آنگن میں ایک کالا پتھر آ کر گرے گا۔ آپ سمجھ لیجیے کہ دیوار کے پیچھے مُرلی کھڑا ہے۔ وہ آپ کو ضرورت کی چیزیں پکڑا دے گا' پھر اس نے مدثر کی طرف دیکھا" اب آپ اس کو باہر نہ بھیجیے گا۔ میں اب اگر آیا تو سر پر ویسی پٹی باندھ کر

آؤں گا جیسی یہ لوگ باندھنے لگے ہیں" اس کے منھ سے مکتی باہنی کا نام نکلتا ہی نہ تھا' آپ لوگ مجھے دیکھ کر گھبرا نہ جایئے گا۔[41]

بذلل نے مزمل کے خاندان کے ساتھ ہر طرح کی وفاداری کا ثبوت دیا۔ الطاف فاطمہ نے اپنے ناول میں قاری کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہو طرح کے حالات میں لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ انسان نہ مسلسل اچھا ہوتا ہے اور نہ مسلسل برا، بلکہ ملے جلے رویوں سے زندگی گزارتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات جو ناول میں قابلِ غور ہے وہ یہ کہ یہ نفرت انسان نے خود سے نہیں سیکھی۔ بلکہ اس میں ملک کے سیاست دانوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ جنھوں نے اقتدار کے لالچ میں آکر سادہ لوح بنگالیوں اور مہاجر بنگالیوں کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان دو حصوں میں بٹ گیا۔ یہ ناول پاکستان کے دولخت ہونے کا قصہ ہے۔ اس ناول کے حوالے سے "ڈاکٹر ممتاز احمد خان" اپنی کتاب میں کہتے ہیں۔

سابق مشرقی پاکستان کے المیہ پر افسانے زیادہ تو نہیں مگر چند مل ہی جاتے ہیں لیکن ناول ایک دو ہی لکھے گئے ان میں " چلتا مسافر" کی اہمیت بنتی ہے۔ "چلتا مسافر" میں سابق مشرقی پاکستان کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی حالات کا بہت متاثر کن بیان ہے۔ اور کہیں کہیں تو اتنا زیادہ مؤثر بیان ہے کہ پڑھنے والے کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔[42]

جب بھی کسی ملک پر آفت آتی ہے تو اس کے اثرات آئندہ کئی سالوں تک وہاں کے لوگوں پر رہتے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ جو غلط ہوتا ہوا دیکھ بھی نہیں سکتے مگر حالات کی ستم ظریفی کے سبب مجبور ہیں کہ وہ یہ سب خون ریزی آپنی آنکھوں سے دیکھے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کی نفسیات بہت متاثر ہوتی ہیں۔ ناول میں مصنفہ نے اس کے سبب بذلل کی مدد سے اس دور کے سماج کو جس میں لوگ نفسیاتی طور پر متاثر ہو رہی تھی۔ جب بذلل، جیسا انسان بھی ان سب حالات اور فسادات سے عاجز آ گیا تھا اور آہستہ آہستہ اس کا ذہن متاثر ہونے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک وقت ایسا آیا جس میں آس کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کون سی بات کس کے سامنے کر رہا ہے۔ اس کو کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کے سامنے بول رہا ہے۔ جس کے سبب اس کا باپ پریشان ہو جاتا اور کہتا کہ میرے بیٹا ہذیان بکتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔

ہجرت کبھی بھی کسی کے لیے بھی آسان نہیں رہی۔ بلکہ اس کے لیے نہ صرف دوسروں کے ساتھ جنگ کرنی پڑتی ہے بلکہ خود کے ساتھ بھی مسلسل لڑنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ماضی کی حسین یادوں، گھر بار، دوست احباب، گلی کوچوں کو چھوڑنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں رہا۔ اور پھر یہ ہجرت بھی وہ جو انسان اپنی خوشی سے نہ کرے، بلکہ ملکی حالات کے پیشِ نظر جبراً اسے کرنی پڑے۔ ایسے میں سید مزمل کا چھوٹا بیٹا مدثر جو عمر میں بھی چھوٹا اور ناسمجھ ہے۔ اتنی ہی عمر میں بھی اس نے ارد گرد کے ماحول کا اثر قبول کرنا شروع کر دیا۔ اس بچے کا ذہن اور سوچ اس کی عمر سے کئی گنا زیادہ سمجھدار ہو گیا۔ کہ چپ چاپ اپنے آپ کو حالات کے رروز بروز بدلاؤ پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اپنے گھر اور محلے کو چھوڑنا اس کے لیے کس قدر مشکل تھا۔

> وہ اسی گھر میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا" بھیا کو اس گھر سے لگاؤ نہ تھا لیکن میں۔۔ تو۔۔ میں نے دس سال کی عمر سے اس کنویں سے پانی کھینچا ہے۔ آج میرا باپ دوسری اور میں پہلی مرتبہ اپنا گھر چھوڑ رہے ہیں۔ کیا تمام دنیا میں ایسے انقلاب آتے ہیں کہ لوگ آئے دن بے گھر ہوتے رہتے ہیں۔ یا صرف یہ ہمارا ہی مقدر ہے۔ وہ اتنے دن سے تنہا تھا۔[43]

سقوط ڈھاکہ نے نہ صرف لوگوں کو متاثر کیا بلکہ ادب کے دانشور لوگوں کے جذبات اور فکر کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ احمد ندیم قاسمی اس دور کے حالات کے بارے میں کہتے ہیں۔

> بیشتر عالمی قوتوں کی ریاکاری ہمارے تضادات، کوتاہیوں اور غفلتوں نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہم کٹ کر آدھے رہ گئے ہیں۔ ہمارا باوقار چہرہ خراشوں سے ہٹ گیا ہے۔ شکست کے بعد کا قدرتی ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ خوردہ قوم سناٹے میں آجاتی ہے۔ پاکستانی قوم آج کل اسی سناٹے سے گزر رہی ہے۔[44]

سلسبیل جس کا تعلق ایک پنجابی گھرانے سے ہوتا ہے اس کو بنگالی لڑکے بدلل سے محبت ہو جاتی ہے لیکن نسلی اختلاف کی وجہ سے ان کی محبت بیچ راستے ادھوری رہ جاتی ہے۔ اس ناول میں الطاف فاطمہ نے دکھایا ہے کہ کس طرح مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والا برسر اقتدار طبقہ خود کو باقیوں سے برتر مانتا ہے۔ اور وہاں کے مقامی بنگالی باشندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور چوں کہ مغربی پاکستان کے لوگ مشروقی پاکستان

میں اچھے عہدوں پر تھے۔ جبکہ بنگالی چھوٹے چھوٹے کام اور نوکریاں کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے افسر "اُن" بنگالیوں کی تذلیل کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہوتے جارہے تھے۔ سلسبیل کی شادی مغربی پاکستان میں اس کے تایازاد کے ساتھ طے کر دی گئی اور انھوں نے شادی کے موقع پر تمام تر رسمیں ادا کیں جو کہ کسی بھی شادی کا حصہ ہوتی ہیں۔ سلسبیل اس سب سے ناخوش تھی۔ کیوں کہ ایک تو مشرقی پاکستان کے خون زدہ حالات کی چشم دید گواہ تھی، دوسرا اس کے والدین کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں تھا کہ آیا وہ مشرقی پاکستان میں زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔ ایسے میں اس کا افسردہ ہونا حق پر تھا۔ شادی کی رسمیں کلچر کا حصہ ہوتی ہیں اس لیے سلسبیل نے سوچا۔

> کلچر! لیکن کلچر کا یہ بھی تو تقاضا ہے کہ ایک موت ہو جائے تو سب کا فرض ہے کہ اس کا احترام کریں۔ اور یہاں تو ایک انبوہ پر موت وارد ہوئی ہے۔ اور ہم کلچر کے تقاضے پانے کے لیے روشنیوں اور ڈھول تاشوں کے ساتھ شادیاں رچا رہے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم صرف روشنیوں اور ڈھول تاشوں کے کلچر والی قوم ہیں۔[45]

پاکستان کی اب تک کی تاریخ میں سقوطِ ڈھاکہ ایک غم ناک واقع کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے مختلف افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اس واقع کا ذکر کیا ہے لیکن اگر ناول کی بات کریں تو بہت کم ادیب ہیں جنھوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں ناول تحریر کیے۔ "چلتا مسافر" ایک ایسا ناول ہے جس میں سقوطِ ڈھاکہ کا پسِ منظر اور پوری دردناک کہانی کو الطاف فاطمہ نے اچھے انداز میں لکھا ہے۔ ناول "چلتا مسافر" کے حوالے سے ڈاکٹر بشریٰ پروین کا خیال ہے۔

> سقوطِ ڈھاکہ کہ جس کو المیہ پاکستان کہنا زیادہ بہتر ہے۔ دراصل پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ مصنفین اور ادیبوں نے تاریخی المیے پر زیادہ نہیں لکھا۔ لیکن الطاف فاطمہ نے "چلتا مسافر" لکھ کر یہ فرض ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اردو ناول کی سطح پر اس واقعے پر مکمل خاموشی رہی۔[46]

"چلتا مسافر" کے مذہبی موضوعات:

الطاف فاطمہ نے دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ مذہبی موضوع کو بھی ناول میں شامل کیا۔ مصنفہ نے اپنے ناول کے آغاز میں ایک ایسا نقطہ اُٹھایا جو نو تاریخیت کے تناظر میں مشرقی پاکستان کے سقعط کا سبب بنا۔ ناصرف سقوطِ ڈھاکہ بلکہ تقسیمِ ہند میں بھی اس کا معمولی ہی سہی مگر کردار ضرور ہے۔ اور وہ ہے مذہبی بالادستی کی بنا پر خود کو مذہبی اعتبار ست دوسرے مذاہب یا ذات پات کے اعتبار سے دوسے مسلمانوں کو کم حیثیت تسلیم کرنا۔ ذات پات اور نسل کی بنا پر خود کو دوسرے سے بالاتر ماننا سراسر غلط ہے۔ قرآن مجید نے بھی اس کی شدید مذمت کی ہے۔ ناول میں مصنفہ نے ہر موضوع پر قلم اُٹھانے کے ساتھ ساتھ مذہبی موضوعات کو بھی خاطر میں رکھا اور اس حوالے سے ان نقائص کا بیان کیا جن کے سبب سانحہ سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب بنے۔ ایسے میں الطاف فاطمہ نے بھی اپنی بہن نشاط فاطمہ کی طرح سب سے پہلے تو ذات پات کی تفریق کو ناول کا موضوع بنایا۔ ان دونوں بہنوں نے ذات پات کے مسئلے کو اس لیے بھی ناول میں پیش کیا کیوں کہ اس دور میں مسلمان چوں کہ کافی عرصے سے ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے رہ رہے تھے اور ہندو مت میں تو شروع سے ہی اونچی نیچی ذاتوں کی تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ لہذا مسلمانوں نے بھی ان سے یہ اثر قبول کیا اور اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں کی تفریق "اسلامی مذہب" میں بھی شروع کر دی۔ جیسے الطاف فاطمہ نے ناول میں سید خاندان کا ذکر کیا ہے تو ناول میں جابجا انھوں نے ایسے موضوعات بھی پیش کیے ہیں، جن میں سادات کے گھرانے کو باقی تمام تر ذاتوں سے اعلیٰ اور افضل کہا گیا ہے۔ ناول میں چھوٹی بیٹی کا رشتہ امرتسر سے آتا ہے تو بیگم صاحبہ اپنے شوہر کے سامنے اس بات کو مدعا بناتی ہیں کہ ان کا خاندان سادات کا ہے اور وہ سیدوں سے باہر ہر گز رشتہ نہیں کریں گیں۔ جس پر ان کے شوہر ان کو کہتے ہیں۔

> پھر تم نے شیخ اور سید کا قصہ شروع کر دیا۔ کتنی دفعہ کہا ہے یہ غیر اسلامی باتیں نہ کیا کرو۔
>
> 47

پڑھے لکھے اور دانش ور لوگ اس قسم کی باتوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ مگر کم فہم لوگ دقیانوسی باتیں کرتے ہیں۔ ان باتوں کا نہ مذہب سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی انسانیت سے، مگر اس کے باوجود وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خرابیاں مسلمانوں میں بھی آتی جا رہی ہیں۔ جیسے بیوہ کو ہندو مذہب میں منحوس مانا جاتا ہے اور اس پر سفید کپڑوں کے سوا باقی تمام رنگوں کو اس کے لیے ممنون قرار دے دیا جاتا ہے۔ ایسے میں "نصیبا" جو شادی کے فوراً بعد ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ اس پر لوگوں نے طرح طرح کی بے بنیاد باتیں کیں کہ اس کی نحوست اس کے شوہر کو کھا گئی اور وہ دنیا چھوڑ کر چلا گیا۔ اس لیے اس کے لیے بھی یہی حکم تھا کہ وہ زہرہ کی شادی میں شرکت نہیں کرے گی۔ جس پر سید صاحب جو دین دار اور دنیا دار آدمی تھے۔ وہ ایک روادار شخصیت کے مالک تھے۔ فوراً اس معاملے پر بول پڑے۔

> لاحول ولا قوۃ۔ پھر وہی ہندوانی رسمیں کہ بیوہ کا سر مونڈ دو۔ بجز ایک دھوتی کے کرتا بھی نہ پہننے دو۔ زمین پر سلاؤ زندگی بھر۔ میں کہتا ہوں اس کو بٹھا کر کیوں رکھا ہے اب تک؟ کرو اس کا دوسرا نکاح۔ کیوں عذاب مول لے رہے ہو تم اس کی جوانی کا؟[48]

تقسیم ہند کے بعد سید مزمل اپنے خاندان کے ہمراہ مشرقی پاکستان پہنچتا ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں بھی حالات خراب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بنگالی لڑکا بذلل اور ہندو لڑکا مُرلی ان کی جان بچاتے ہیں۔ اور ان کو راشن اور ضروریات کی چیزیں مہیا کرتے ہیں جسے لیتے ہوئے سید صاحب تھوڑے ہچکچاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ مزمل کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا، اور ایک وقت ایسا بھی تھا جب وہ اور اس کا خاندان غریب لوگوں کو راشن اور ضروریاتِ زندگی کی تمام تر اشیا مہیا کرتے تھے۔ اس لیے آج اسی مزمل کے لیے یہ راشن وصول کرنا قدرے مشکل امر بن گیا۔ چناں چہ وہ مُرلی کو آیندہ یہ راشن لانے سے منع کرتے ہیں۔ جس پر مُرلی جواب دیتا ہے۔

> یہ میرا احسان نہیں ہے، انکل۔ یہ بذلل کا حکم ہے۔ اور اس نے یہ بھی کہا تھا۔ کہ تم ان سے حساب کر کے ایک ایک پیسہ لے لینا۔ وہ سید ہیں اور ہم سید کو شرمسار نہیں کرتے۔ وہ خیرات نہیں لیتا۔ وہ خود زکوۃ دیتا ہے۔ اچھا اب آپ جلدی سے حساب کر لیں۔[49]

زیرِ درج اقتباس سے اس بات کی مذہبی تاریخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ سیدوں پر زکوٰۃ، خیرات واجب نہیں ہے۔ چناں چہ الطاف فاطمہ نے اس موضوع کو مذہبی موضوع کی صورت میں اپنے ناول میں تحریر کر کے ناول کو ہر پہلوؤں سے مکمل کیا۔

منتخب کردہ ناولوں جو مقالے کا حصہ ہیں، وہ 1947 کے واقعات اور سانحہ 1971 کے دل دہلا دینے والے واقعات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ نشاط فاطمہ کے ناول کے موضوعات میں آزادی برصغیر کے بارے میں اتنا مفصل نہیں لکھا گیا جتنا انھوں نے سقوط ڈھاکہ کے واقعے کو دل جمعی سے لکھا ہے۔ جبکہ زیر تحقیق مقالہ میں شامل دوسرا ناول "چلتا مسافر" میں ایسے موضوعات ہیں جس میں انھوں نے دونوں واقعات کے بارے میں مفصل انداز میں لکھا ہے۔ یہ ناول ہمارے سامنے دو فصلوں میں آتے ہیں۔ ایک فصل میں آزادی کا بیان ہے جبکہ دوسری میں سقوط ڈھاکہ کے واقعے کے موضوعات کا نو تاریخی مطالعہ کیا ہے۔ دونوں ناول نگار خواتین نے اپنے موضوعات کے ذریعے ان تاریخی واقعات کی مبہم منظر کشی کی ہے جس کے ردِ عمل میں یہ واقعات نہ صرف تاریخ کا حصہ بنے بلکہ ہمارے ادب میں بھی شامل ہو گئے۔ درج بالا موضوعات میں ان موضوعات کا بیان بھی ملتا ہے جس سے مصنفہ کے اس دور کی ذہنی کشمکش کا اندازہ بھی خوب انداز میں لگایا جا سکتا ہے۔ جیسے نشاط فاطمہ نے اس ناول میں سقوط ڈھاکہ کے واقعے کے بارے میں ایسی کہانی بیان کی ہے جس سے اس دور میں ہونے والے عمومی رویے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے ڈھاکہ کے بارے میں ایسا لکھنے کی اصل وجہ یہ بھی ہے کہ نشاط فاطمہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ہمراہ کچھ عرصہ مغربی پاکستان میں قیام پذیر رہیں۔ وہاں رہ کر انھوں نے مغربی پاکستان کے لوگوں کو اور ان کے مسائل کو بہت ہی قریب سے دیکھا تھا۔ جس کی وجہ سے مصنفہ نے مکمل انصاف کر کے اس کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔

حوالہ جات

1۔ منظور احمد ، ڈھاکہ پیش منظر اور پسِ منظر، (کالم)، مشمولہ: روزنامہ جنگ 'لاہور، 11 دسمبر 1985، ص12

2۔ سلیم منصور خالد، البدر، لاہور، ادارہ مطبوعاتِ طلبہ، 1985، ص21

3۔ https://www.express.pk

4۔ ڈاکٹر صفدر محمود، سقوطِ مشرقی پاکستان، محولہ بالا1، ص43ص

5۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا ، الفیصل ناشران، لاہور، اٹھارواں ایڈیشن، 2005، ص213

6۔ مسعود مفتی، ریزے، لاہور، دوست پبلیشر، 1996، ص12

7۔ قیصر قیصریٰ ودیگر مرتبین، وطن کا قرض، کراچی، ایوان ادبیات، 1991، ص13

8۔ محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، اسلام آباد، پورب اکادمی، 2009، ص278-279

9۔ زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات، ادارہ یادگار غالب، کراچی، 2016، ص326

10۔ نشاط فاطمہ، آنسو جو بہہ نہ سکے، فیروز اینڈ سنز، 1971، ص۔19

11۔ ایضاً۔ ص7 5

12۔ ایضاً۔ ص131

13۔ ایضاً۔ ص205

14۔ ایضاً۔ ص7

15۔ ایضاً۔ص91

16۔ ایضاً۔ص120

17۔ ایضاً۔ص5 12

18۔ ایضاً۔ص251

19۔ ایضاً۔ص327

https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%AC%D8%B0%D8%A7%D9%85۔20

21۔ نشاط فاطمہ، آنسو جو بہہ نہ سکے، فیروز اینڈ سنز، 1971، ص125-126

22۔ ایضاً۔ص248

23۔ ایضاً۔ص۔254

24۔ ایضاً۔ص303

25۔ انتظار حسین، نقوش، جلد دوم، افسانہ نمبر، ادارہ فروغ اردو بازار لاہور، ص105

26۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، بار اول، 1987، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ص7

27۔ رشید احمد گوریچہ، ڈاکٹر، "اردو میں تاریخی ناول"، ابلاغ لاہور، جولائی 1994، ص406

28۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، فیروز سنز اینڈ لمیٹیڈ، لاہور، 2016، ص26

29۔ ایضاً۔ص57

30۔ ایضاً۔ص125

31۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ تحقیق و تنقید، بیکن بکس ملتان، 1988، ص26

32۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، فیروز سنز لمیٹڈ، 2016، چوتھی اشاعت، ص143

33۔ ایضاً۔ ص152

34۔ ایضاً۔ ص155

35۔ ایضاً۔ ص193

36۔ humsub.com.pk,2.35. pm.01/08/2022

37۔ زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، 2016، اشاعتِ اول، ص،157

38۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، فیروز سنز لمیٹڈ، 2016، چوتھی اشاعت، ص58

39۔ ایضاً، ص57

40۔ ایضاً، ص180

41۔ ایضاً، ص208

42۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، "آزادی کے بعد اردو ناول"، فضلی سنز (پرائیوٹ) لمیٹیڈ، سال اشاعت، 1997، ص135

43۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، فیروز سنز لمیٹڈ، 2016، چوتھی اشاعت، ص،259

44۔ احمد ندیم قاسمی، ماہنامہ "فنون" لاہور، دسمبر 1971، ص3

45۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، فیروز سنز لمیٹڈ، 2016، چوتھی اشاعت، ص،331

46۔ بشریٰ پروین، ڈاکٹر، پاکستانی ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ۔ 1947 تا 2000، مقالہ (برائے ایم۔فل)، نمل یونی ورسٹی اسلام آباد، 2007، ص86

47۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، فیروز سنز لمیٹڈ، 2016، چوتھی اشاعت، ص،24

48۔ ایضاً۔ ص33

49۔ ایضاً۔ ص216

باب سوم:

نو تاریخیت کے تناظر میں "آنسو جو بہہ نہ سکے" اور "چلتا مسافر" کا کرداری مطالعہ

ادب کی کوئی بھی صنف ہو مثلاً ناول، افسانہ یا داستان یہ تمام اصناف کسی نہ کسی کہانی کی صورت میں پیش کیے جاتے ہیں اور کسی بھی کہانی کو بننے کے لیے کرداروں کی مدد لی جاتی ہے۔ یعنی کرداروں کے مکالمے، بات چیت اور حرکات و سکنات تمام کردار نگاری میں شامل ہیں۔ مصنف اپنی کہانی میں مختلف واقعات کو پیش کرتا ہے۔ ان واقعات میں ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ اور جب ہمارے سامنے ہر طبقے کے لوگ آتے ہیں تو ان طبقات کے الگ الگ مسائل ہوتے ہیں۔ جن کو مصنف اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروِ کار لاتے ہوئے ان کو کہانی کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ "کشاف تنقیدی اصطلاحات" میں اس کی تعریف یہ ہے۔

> انسان کی شخصیت اور کرداروں کو جانچنے کے لیے جو نئے پیمانے وضع کیے، ان سے متاثر ہو کر کہانی ایک باضابطہ فن بن گئی۔[1]

ادب میں کوئی بھی صنف ہو اس کو کرداروں کے بغیر تخلیق کرنا ممکن نہیں ہے۔ بعض ادب پارے ایسے ہیں جن میں موجود کردار واضح ہیں اور بعض اوقات کردار مبہم صورت میں بھی نظر آتے ہیں۔ مگر ان کا دھندلا سا ہی سہی وجود ہوتا ضرور ہے۔ کردار "فارسی" زبان کا لفظ ہے۔ جس سے مراد فرد کی چال، طریقہ انداز، رنگ، کام، عادات، اخلاق سب شامل ہیں۔ اگر اس کی عمومی تعریف کی جائے تو کردار کسی بھی فرد کی عادات و خصائل، اخلاق، عمومی روئے، چال چلن کو کہتے ہیں، اردو لغت میں کردار کی تعریف کچھ اس طرح ہے۔

> انسانی شخصیت پر روشنی ڈالنا، سیرت نگاری، کردار نگاری، کسی کی اچھائی یا برائی کرنا کردار کہلاتا ہے۔"[2]

داستان گوئی میں جو کردار ہوتے ہیں وہ خواہ مرکزی کردار ہوں یا عمومی کردار ہوں، پوری کہانی پر غالب نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اصناف ادب میں داستان گوئی کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ داستان گوئی کو اس لیے بھی اہم سمجھا جاتا ہے کہ اس میں مثالی کرداروں کی مدد سے ایک ہیرو تخلیق کیا جاتا ہے، جو نیک سیرت اور بہادر ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس بات پر تو سب کو یقین ہے کہ نیکی اور بدی دو طاقتیں ہیں۔ ان دونوں کو کرداروں کی شکل میں ڈھال کر ایک مثالی کردار ہیرو کا یا ایک برا کردار ولن تخلیق کر کے نیکی اور برائی کی تمیز کی جاتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے ایسے کرداروں کو ہی پسند کرتا آیا ہے جو غیر معمولی حد تک بہادر اور نڈر ہوں۔ ایسے کردار جو مافوق الفطرت کارنامے سر انجام دے سکتے ہوں۔ اس کے لیے پہلے پہل تو جن، پریاں اور دیو کے کردار تخلیق کیے گئے تھے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تخلیق کاروں کی ذہنی استعداد بڑھتی گئی تو ان کے قلم سے ایسے کردار تخلیق ہوئے جو بظاہر تو انسانی کردار ہیں۔ مگر ان کے اندر مافوق الفطرت عناصر موجود ہیں۔ جس کو "ہیرو" کا نام دیا گیا۔ اس میں بادشاہ، شہزادے اور شہزادیوں جیسے کردار غالب آنے لگے۔ لکھاریوں نے ادب میں ایسے کردار بھی تخلیق کیے ہیں جو عادات سے درندہ صفت ہیں اور ذہن انسانی خصوصیت کا حامل ہے۔ مثلاً سر انسان کی مانند اور دھڑ کسی شیر یا گھوڑے کی طرح کی جسامت رکھنے والے کردار بھی داستانوں میں نظر آئے ہیں۔ اس کے بعد جب مغربی اصناف نے ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو اس بات کو شدت سے محسوس کیا گیا کہ نیکی اور بدی کے علاوہ بھی کچھ عوامل شامل ہونے چاہیے۔ بلکہ انسان کے اندر ذہنی اور جسمانی جو جنگ ہمہ وقت چل رہی ہوتی ہے، اس کو بھی ادب کا حصہ بنایا جائے۔ چناں چہ ادب میں مزید کردار بھی تخلیق کیے جانے لگے۔ اردو کا پہلا ناول جب منظرِ عام پر آیا تو اس بات کا اندازہ ہوا کہ اردو ناول کس تیزی سے ترقی کے منازل طے کرے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتدائی ناول اور افسانوں میں لکھاریوں نے ایسے ایسے لازوال کردار تخلیق کیے جن کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم نہیں ہوئی، بلکہ بڑھتی ہی چلی گئی۔ مثلاً اردو کا پہلا ناول جس میں نذیر احمد نے "اصغری اور اکبری" جیسے بے مثال کردار تخلیق کیے۔ جو آج بھی قابلِ ذکر ہیں۔

اردو ادب میں قدم رکھنے والی اصناف میں خواہ وہ ناول ہو، افسانہ یا داستان ہو۔ ان تمام نے ترقی پانے کے لیے ان تھک محنت کی اور بالآخر اپنی الگ شناخت بنائی۔ لیکن ان تمام اصناف کے ترقی پذیر ہونے کے پیچھے

جو بنیادی چیزیں ہیں، وہ منظر نگاری، پلاٹ اور سب سے بڑھ کر کردار نگاری ہے۔ یہ تین وہ اجزا ہیں جن کے بغیر کوئی بھی کہانی تخلیق کرنا ہر گز ممکن نہیں ہے۔ خصوصاً کردار نگاری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ کردار ایک اہم جزو ہے۔ جس کو لکھاری اپنے تخیل سے بناتا ہے اور جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ لکھاری اپنی مرضی سے اس کو حالات و واقعات کے مطابق موڑتا جاتا ہے۔ اس سے کہانی با آسانی اپنے انجام تک پہنچ جاتی ہے۔ پوری کہانی میں کرداروں کی اس موڑ توڑ سے قاری کی دلچسپی بھی واقع در واقع بڑھتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم اس حوالے سے ایک جگہ لکھتی ہیں کہ

> کہانی کی تشکیل میں ان ہی تین اجزا میں سے کسی ایک کو مرکزی نقطہ بنا کر کہانی کار کہانی کی تشکیل کرتا ہے۔ کہانی کبھی پلاٹ کے ذریعے واقعیت کی بنیادوں پر بُنی جاتی ہے تو کبھی کردار کہانی کا انکشاف کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی فضا کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے اور اس کے ذریعے کہانی بیان ہوتی ہے۔[3]

اردو ادب میں کردار نگاری میں کسی انسان کے اوصاف اور اس کی صورت و سیرت شامل ہوتی ہے۔ ان اوصاف میں انسان کے اندر موجود تمام تر خصوصیات کو دیکھا جاتا ہے۔ جس سے اس کی سیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس میں اس کی گفتگو، اندازِ بیان، لب لہجہ، عادات و خصائل، لباس اور پہناوا شامل ہوتا ہے۔ مصنف کے تخلیق کردہ کردار جن میں یہ تمام جملہ خصوصیات شامل ہیں وہ قاری کے ذہن پر اثر چھوڑ دیتی ہیں۔ جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہانی میں کرداروں کو سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ کرداروں کی بدولت ہی لکھاری کہانی کا پلاٹ تخلیق کرتا ہے۔ مثلاً جیسا کردار ہو گا، تو اس کے مطابق ہی پلاٹ بنایا جائے گا۔ یہاں تک کہ واقعات جو کہانی میں شامل ہوتے ہیں وہ بھی کرداروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کی باہمی گفتگو اور بات چیت سے وجود میں آتے ہیں۔ مصنف کو کردار تخلیق کرتے وقت بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ کیوں کہ مصنف جیسا کردار تخلیق کرے گا، ضروری ہے کہ اس کے عادات و خصائل اور رہن سہن بھی ویسا ہی ہونا چاہیے۔ مثلاً لکھاری ایک ایسا کردار تخلیق کرتا ہے، جو ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ تو ضروری ہے کہ اس کردار کو تشکیل دیتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اس کے عادات و خصائل اور زبان و بیان بھی اس خاص طبقے سے ملتے ہوں۔ اگر مصنف کا تخلیق کردہ کردار اونچے طبقے سے ہو گا، مگر اس کی زبان

و بیان عمومی طبقے کی زبان ہو گی تو وہ کردار مضبوط نہیں ہو گا۔ اس کے لیے لازم ہے کہ کرداروں کے لباس، الفاظ کا انتخاب، چال چلن اس طبقے سے ہو جو سماجی زندگی سے قریب تر ہو۔ تا کہ قاری نہ صرف ایک کہانی پڑھ رہا ہو بلکہ ایک مخصوص عہد کا سفر بھی کر رہا ہو۔ ادب پاروں میں کردار کو تشکیل دینے میں خاص مہارت کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ اور کرداروں پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ کیوں کہ یہی کردار ہیں جو کسی بھی ادب پارے کی اساس ہوتے ہیں۔ انہیں سے کہانی چلتی ہے۔ کسی ناول یا افسانے میں جس طرح کا موضوع ہو گا، اس کے کردار بھی اسی مناسبت سے سامنے آئے گے۔ اب سوال یہ ہے کہ لکھاری مختلف طرز کے کردار کس طرح تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ مصنف کو ہمارے معاشرے کا حساس ترین طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے مصنفین اپنے ارد گرد ہونے والے حالات و واقعات اور لوگوں کے رہن سہن کو دیکھتے ہیں تو اس کا اثر لیتے ہیں۔ جس کی مدد سے وہ کرداروں کو تخلیق کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہنا ہر گز بھی غلط نہیں ہو گا کہ تمام تر کردار کہیں نہ کہیں ہمارے معاشرے اور سماج سے ہی اخذ کیے ہوتے ہیں۔ ان افراد کے مسائل، روز مرہ مشکلات اور عمومی رویوں کا مصنف طبقہ بہت باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور اسی طرح ان کے لوگوں کے مسائل اور طرزِ زندگی میں تھوڑا ردو بدل کر کے کہانی میں شاملِ موضوع کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سنبل نگار کردار نگاری کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

> ناول نگار کو مختلف زاویوں سے کردار پر روشنی ڈالنے اور اسے اجاگر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جب کہ افسانہ نگار کردار کا کوئی ایک پہلو کامیابی کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔ افسانہ نگار کو بڑی محنت کر کے کردار کو اس طرح تراشنا پڑتا ہے کہ وہ قاری کے دل میں گھر کر سکے۔[4]

پھر جوں جوں ادب ترقی کرتا چلا گیا، وقت کے ساتھ ساتھ موضوعات میں بھی وسعت آتی گئی۔ جس سے اس کے کرداروں میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس کے سبب وہ کردار سامنے آئے جو ہمارے معاشرے کے ہی زندہ جیتے جاگتے انسان ہیں، لیکن مجبوریوں اور غربت کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو منوا نہیں سکے۔ جو اندر سے تو اعلیٰ اوصاف کے مالک ہیں مگر معاشرے میں ان کی حیثیت معمولی چیز کے سوا کوئی نہیں ہے۔ مصنفینِ ادب نے ان حقیر لوگوں کو فرش سے اُٹھا کر عرشِ قلم پر بٹھایا۔ اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے

تعلق رکھنے والے لوگوں کی مشکلات اور روز مرہ مسائل کو بیان کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو جتنی بھی زیادہ محنت کر لیں مگر حالات کے سبب سامنے نہیں آسکے۔ پھر مصنفین نے ان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسے ہی کرداروں کو تخلیق کیا جو اپنی زندگی میں کچھ اسی طرح کے مسائل سے دوچار تھے۔ لکھاریوں کا ادب پر بہت احسان ہے کیوں کہ ان لوگوں نے ادب میں نئے نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ اس چیزوں کو بھی سامنے لائے جو شاید کسی وجہ سے سامنے نہ آسکتے ہوں گے۔ مصنفین نے ان تخیلی کرداروں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی جو رومانیت کے زیرِ اثر تھے۔ یہ وہ کردار تھے جو محبت اور جنس کی کشمکش میں پوری کہانی میں نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب مغربی تراجم نے برصغیر کا سفر کیا۔ تو وہ اپنے ساتھ نفسیات جیسا حساس ترین موضوع لائے۔ اور ہمارے لکھاری جو پہلے ہی حساس ترین احساسات کے مالک ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس کا بہت اثر قبول کیا۔ چناں چہ ان تراجم کی بدولت مصنفین نے نفسیاتی الجھنوں، اندرونی کشمکش، آسودگی کو کرداروں کی مدد سے سامنے لانے کی کوشش کی۔ جو ہمیں ممتاز مفتی، منٹو اور عصمت چغتائی کی کہانیوں میں کرداروں کے ضمن میں نظر آتی ہیں۔ ادب کا ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جس نے نہ صرف ہر خاص و عام کو متاثر کیا وہیں مصنفین کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہ وہ دور تھا جس میں برِ صغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ہندوستان اور پاکستان بنا دیا۔ اس تقسیم کے دوران بہت سے غیر معمولی واقعات پیش ہوئے، جن کی گنتی کرنا ناممکن ہے۔ مگر ان تمام تر واقعات میں کرداروں کی آسودہ حال زندگی، ذہنی کشمکش اور نفسیاتی الجھنوں کو کہانی کے پیرائے میں لکھا گیا۔ اس سب کی بدولت ادب کو فائدہ یہ ہوا کہ کرداروں کی نئی تراشی ہوئی اور عمدہ کھیپ ادب میں داخل ہوئی۔ مزید یہ کہ اردو ادب کے موضوعات میں بھی وسعت آئی۔ ہندو مسلم تضادات، گھروں کے اجڑ جانے کے اسباب، بے دخلی، فسادات، بے وطنی اور اپنوں سے بچھڑ جانے کا غم۔ ان تمام تر اسباب نے نت نئے کرداروں کو جنم دیا۔ جن کے ذریعے مصنف نے قارئین کو اس عہد کا سفر کروایا، جس میں ان کرداروں (لوگوں) نے ظلم و ستم، سفر کی صعوبتیں، خون کی ندیاں، ہجرت کے مسائل اور جنسی زیادتیوں کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ ان کا مقابلہ بھی کیا۔ اس کے بعد وہ دور آیا جس میں علامتی کردار نگاری کے نت نئے تجربات کیے گئے۔ کیوں کہ اس دور میں زبان پر پابندی عائد ہو گئی تھی۔ چناں چہ لکھاریوں نے اپنی ذہنی کشمکش کو علامتی انداز میں پیش کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خیال امروہی اپنی ایک کتاب میں کہتے ہیں۔

فن کارانہ تشکیلات جو سماجی، ذہنی اور دیگر وسائل سے انسانی چال چلن میں نمودار ہوتی ہیں۔ مخصوص انسانی رویہ جو مخصوص حالات کی بدولت پیدا ہوا تا ہے۔ آرٹ جمالیات کا متقاضی ہوتا ہے۔لہذا ہر انسان رویہ آرٹسٹ کی کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔[5]

1971 میں ہونے والے واقعے نے بھی لوگوں کے ذہنوں پر گہرے اثرات چھوڑے۔ سانحہِ سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے بہاریوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اور بنگالیوں اور ہندوؤں کے مل جانے سے جو قتل ریزی ہوئی۔ وہ ناقابلِ تلافی تھی۔ اس دور کے ادیبوں نے اس کا خاص اثر اس لیے بھی لیا، کیوں کہ بنگلا دیش کو پاکستان کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ چناں چہ صدیوں سے چلتی آرہی ہندو مسلم چپقلش میں سب سے زیادہ نقصان بنگالیوں کا اور بنگلہ دیش میں رہنے والے مسلمان بہاریوں کا ہوا۔ بہت سے ادیبوں نے اپنی کہانیوں میں سقوطِ ڈھاکہ کو موضوع بنایا۔ ایسے میں نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ نے بھی سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں لازوال ناول لکھ ڈالے۔ جو آج کے پڑھنے والے قارئین کو بھی ایسے ہی متاثر کرتے ہیں گویا ابھی کل کی ہی بات ہو۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر قارئینِ ادب کے ذہن، اس دور میں ہونے والی خون کی ندیاں بہنے والوں پر نوحہ کناں ہیں۔ نشاط فاطمہ کا ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" اور الطاف فاطمہ کا ناول "چلتا مسافر" نہ صرف سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں لکھے جانے والے ناول ہیں بلکہ ان کے مذکورہ ناولوں میں سانحہ سقوطِ ڈھاکہ کے ہونے کے اسباب اور اس کے بعد کے ان (کرداروں) کے مشکل ترین سفر کا بیان نظر آتا ہے۔ نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ نے اپنے اپنے ناولوں میں ایسے کرداروں کو تخلیق کیا ہے، جو نو تاریخیت کے زمرے میں مستقبل کی تصویر کشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے منتخب کردہ کردار، ہمارے اس دور کے سماج کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں جس دور میں یہ سانحہ پیش آیا۔ ان کے کرداروں کو منتخب مقام اس لیے بھی حاصل ہے، کیوں کہ وہ حال میں رہتے ہوئے، مستقبل کی پیشن گوئی کرتے ہیں۔ جس سے ان کے اندر کی کشمکش اور مسائل کو سمجھنا قدرے آسان لگتا ہے۔ ان تخلیق کردہ کرداروں نے نہ صرف ہجرت کے مسائل دیکھے، زندگی میں آنے والی مشکلات کا سامنا کیا، بلکہ سانحہ سقوطِ ڈھاکہ کا شکار بھی ہوئے۔ کسی نے اپنوں کو ہجرت میں کھویا تو کسی نے سانحہ سقوطِ ڈھاکہ میں کھو دیا۔ اپنوں سے بچھڑ کر تنہا زندگی گزارنے میں جو مسائل درپیش آئے۔ وہ سب نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ نے اپنے کرداروں کی مدد سے کہانی کہ صورت میں پیش کیے ہیں۔

"آنسو جو بہہ نہ سکے" کے عمومی کرداری (سیاسی، سماجی، مذہبی)

ادب کی کوئی بھی صنف اُٹھا کر دیکھ لیں خواہ وہ ناول ہو، افسانہ، ڈرامہ یا داستان، کوئی بھی صنف ایسی نہیں ہے جس میں کردار نہ ہوں۔ کیوں کہ کہانی کی شروعات ہی کرداروں کی بدولت ممکن ہے۔ کسی بھی کہانی کا آغاز ہو یا اختتام کرداروں کے ذریعے سے ہی ہوتا ہے۔ کہانی میں کردار لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ آج کے قارئینِ ادب کردار ایسا پسند کرتے ہیں، جو نہ صرف اصل زندگی سے قریب تر ہو بلکہ چلتے پھرتے انسانی خصوصیات کا مالک بھی ہو۔ اگر کردار حقیقی دنیا سے تعلق نہیں رکھتا ہو گا ایسے مصنوعی کرداروں کو قارئین میں مقبولیت نہیں ملتی۔ چناں چہ وہ کردار اصل زندگی کا عکاس ہو گا۔ ایک محبت کا جذبہ رکھنے والا کردار ہی قاری کے ذہن پر اثر چھوڑتا ہے۔ نشاط فاطمہ کے ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ان کے کردار ہیں، جو اصل میں نو بادکار ہیں مگر ایک دردِ دل رکھنے والے کردار ہیں۔ ان کا یہ ناول پڑھ کر قاری حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک عیسائی انگریز جس طرح لگن کے ساتھ برصغیر کے لوگوں کا نہ صرف علاج کرتا ہے بلکہ وقتاً فوقتاً ان کی دلجوئی بھی کرتا ہے۔ تاکہ وہ واپس زندگی کی طرف لوٹ سکیں۔ وہ ان سے نفرت یا کراہت نہیں کرتا بلکہ ان کی چارہ گری کرتا ہے۔ نشاط فاطمہ نے اپنے کرداروں کو تخلیق کرتے وقت بہت محنت کی ہے۔ ان کے ناول میں ہر طبقے اور ہر عمر اور جنس کے اعتبار سے کرداروں میں نفسیاتی اور فطری فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس طرح ایک مثالی کردار ہمارے سامنے آتا ہے اور مثالی کردار وہی بنتا ہے جو زندگی کے پیچیدہ مراحل سے گزر کر اپنی امتیازی حیثیت منوالے۔ کردار اور کہانی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کیوں کہ کہانی کے کردار اصل زندگی سے قریب تر ہوتے ہیں۔ مگر اصل زندگی کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ ایسا کرنے سے کہانی میں ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ جبکہ کہانی میں فنی خوبیاں پیدا کر کے کہانی کے کرداروں کو حقیقی زندگی کے کرداروں سے الگ کیا جاتا ہے۔ کرداروں کی یہ انفرادیت ناول میں جابجا نظر آتی ہے۔

"آنسو جو بہہ نہ سکے" کے سیاسی کردار

ادب کی تمام اصناف میں ہجرت کو تمام مصنفین نے موضوع بنایا۔ اور اس دور کے معاشرے کی تصویر کشی کی۔ اس دور کے لکھنے والوں نے انگریزوں کے ظلم اور بربریت کو ناول کا موضوع بنایا لیکن نشاط فاطمہ نے اپنے کرداروں کو تمام لوگوں سے ہٹ کے پیش کیا۔ کیوں کہ وہ اس بات کی قائل تھیں کہ کوئی بھی رویہ مسلسل نہیں ہوتا۔ نہ کوئی انسان مسلسل اچھا رہتا ہے اور نہ کوئی برا۔ بلکہ دونوں چیزیں متضاد رہتی ہیں۔ نشاط فاطمہ نے اپنے کرداروں کو تخلیق کرتے وقت بہت سوچ بچار اور محنت سے کام لیا۔ ناول میں نشاط فاطمہ نے ہر طبقے کے کردار تخلیق کیے ہیں۔ خواہ امیر ہو یا غریب، عیسائی، ہندو، مسلم، بنگالی، بہاری سب کردار ناول میں نظر آتے ہیں۔ ناول میں مصنفہ نے ایک ایسے انگریز خاندان کی کہانی بیان کی ہے جو نو آبادکار کی حیثیت سے ہندوستان اپنے خاندان کے ہمراہ جارہا ہوتا ہے۔ لیکن نو آبادکار ہونے کے باوجود بھی اس کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان اب پہلے جیسا ہندوستان نہیں رہا، بلکہ اب وہاں کے لوگوں میں شعور آگیا ہے۔ اپنے حق کے لیے آوازیں بلند کرنا سیکھ گئے ہیں۔ اب وہ انگریزوں کی غلامی نہیں چاہتے بلکہ اپنی الگ مملکت میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ پہلے کے حالات اور تھے۔ انگریز جب شروع شروع میں ہندوستان گئے تو انھوں نے ان کی سیاست، سماج اور معاشرے کے اعلیٰ عہدوں ہر قبضہ کر کے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ ہندوستان کی عوام انگریزوں کے مظالم سہہ سہہ کر عاجز آگئے۔ تو ان کے اندر ایک باغی نے جنم لینا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ وہ انگریزوں کے خلاف اکھٹے ہو گئے۔ اور ان کو ملک سے نکالنے کے لیے تدبیریں کرنے لگے۔ ایسے میں وکٹوریہ حکومت کے ختم ہو جانے سے انگریزوں کی جڑیں کمزور پڑتی گئیں۔ اس بات کا برصغیر کے لوگوں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ اور ان کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ چناں چہ نئے آنے والے لارڈز کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ یہی وجہ تھی لارڈ ہمفری جو کہ چیف کمشنر کے عہدے پر ہندوستان جارہا ہے، جانے سے ایک رات قبل اپنی بیوی کو سمجھاتا ہے کہ وہاں کے لوگوں کو کسی صورت کم حیثیت نہ سمجھے۔ اب ان کو اپنے حق کے لیے لڑنا آگیا ہے۔ لارڈ ہمفری ہندستان کے بدلے ہوئے رجحان سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اپنی بیوی جین سے بھی کہتے کہ لوگوں کی باتوں پر توجہ نہ دے کہ ہندوستان کی زمین مٹی نہیں سونا ہے۔

میں یہ بتا رہا ہوں کہ یہ بیسویں صدی ہے اور اس صدی کے آغاز میں وکٹوریہ ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان کی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کرو، تمہارے بچپن میں خواتین یہاں آ کے خوابناک باتیں کرتی تھیں کہ وہاں مٹی میں سونا ملا ہے۔ بس اُٹھانے کی دیر ہے۔ اب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔[6]

وہ اپنے بیوی بچوں کو اچھی طرح سے یہاں کے حالات بتا کر ہندوستان لے کر آئے تھے۔ اور اس بات کی سخت تاکید کی تھی کہ وہاں کے مقامی لوگوں سے اچھی طرح سے گھل مل کر رہیں۔ ایسا وہ اس لیے کہہ رہے تھے کہ کہیں نہ کہیں ان کے اپنے اندر اس بات کا خوف موجود تھا کہ آج نہیں تو کل ان کی حکومت کو ختم ہو ہی جانا ہے اور ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ان کو یہاں سے نکال باہر کیا جائے گا۔ یہ تمام تر خدشات وہ تھے جو لارڈ ہمفری اپنے بیوی بچوں سے تو نہ کر سکتے تھے۔ مگر دِل ہی دِل میں یہ پریشان کن سوچ ان کے اندر سے ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ پھر ایک بات اور بھی تھی کہ ان سب حقائق کی وجہ سے ان کے دونوں بیٹوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگنے کا خطرہ لاحق تھا۔

ہندوستان نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ کیوں کہ انھیں آزادی نہیں مل رہی ہے۔ انگلستان میں بے کاری بڑھ رہی ہے۔۔۔۔ پتہ نہیں کیا ہو گا۔ انگلستان میں بے کاری بڑھ گئی ہے۔ میرا ماضی اور میرے بچوں کا مستقبل غیر محفوظ ہے۔[7]

نشاط فاطمہ نے لارڈ ہمفری کا کردار ایسا ملا جلا بنایا ہے کہ ایک طرف تو وہ ہندوستان میں نو آبادکار بن کر آئے ہیں مگر دوسری طرف وہ ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں اچھا بھی سوچتے ہیں اور ان کا احساس کرتے ہیں۔ ان کے اس احساس اور فکر کے پیچھے کیا مقاصد ہیں؟ آیا وہ ہندوستان میں اپنی اور اپنے بچوں کی جگہ بنانا چاہتا ہے۔ یا اصل میں بھی وہ مخلص ہے؟ یہ ایک الگ بحث ہے، مگر لارڈ ہمفری بعض اوقات دُکھی بھی ہو جاتے تھے کہ انگریزوں نے ہندوستان کو بہت کچھ دیا ہے۔ ہندوستان کی زمین بہت زرخیز زمین مانی جاتی تھی اور معدنیات کے حوالے سے بھی اس زمین کے اندر بہت سے وسائل دفن تھے۔ اتنے وسائل ہونے کے باوجود ان وسائل کا صحیح استعمال ہندوستانیوں کو نہیں معلوم تھا۔ ان وسائل کا بہتر استعمال برصغیر کی عوام کو انگریزوں نے سکھایا۔ ان کے ہاں وسیع مقدار میں پائے جانے والے کوئلے انگریزوں نے ریلوے اور بجلی کا نظام بنایا۔

اور ان کے وسائل سے ان کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی فیض یاب ہوئے۔ مگر جب لارڈ ہمفری ہندوستان کے لوگوں کی موجودہ حکمت عملیوں اور باغی رویوں کو دیکھتے تھے تو فکر مند ہو جاتے تھے۔ کہ آج نہیں تو کل ان کو یہ ملک چھوڑ کر جانا پڑ جائے گا۔ ان کو تو یہاں کے موسموں، ہوا اور خاص طور پر یہاں کے لوگوں کی عادت ہو گئی تھی۔ پھر وہ کیسے واپس جا کر انگلستان میں زندگی گزارے گیں۔ ان کے لیے یہاں کی سرزمین کو چھوڑ کر اپنے ملک میں جا کر رہنے کے خیال سے ہی پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب یہاں کے لوگ انگریزوں کو پکڑ پکڑ کر ہندوستان سے نکال دیں گیں۔ اس وقت وہ یہ نہیں دیکھیں گیں کہ کون سا انگریز ان کے بارے میں فکر مند ہے اور کون سا ان کے خلاف ہے۔ اس وقت ان کی نظر میں سب انگریز برابر ہوں گیں۔ اچھے اور بُرے کی تمیز کرنا ان کے لیے اس لیے بھی ممکن نہیں رہے گا، کیوں کہ انگریزوں نے اتنے سالوں میں یہاں رہ کر ان سے ان کے جائز حقوق چھینے اور ان کے سامنے ان کے اپنوں کو تکلیف دی۔ تو اب یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ انگریزں پر رحم کھاتے۔ ہندوستانیوں کے لیے سب کے سب انگریز نو آبادکار تھے۔ جو زبردستی ان کے ملک پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے تھے۔

> ہندستان آزاد ہو گیا۔ بلکہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ یہ فتح ہمیں بڑی مہنگی پڑی۔ ایک طرف ہم نے فتح اور کامرانی کے جھنڈے گاڑے، دوسری طرف سے ہم نے اپنا جھنڈا اُکھاڑ لیا۔ یعنی بغیر جنگ کے ہار گئے۔ صد افسوس۔[8]

مگر لارڈ ہمفری کو اب اس سرزمین کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ وہ اب یہاں سے کسی صورت بھی نہیں جانا چاہتے تھے۔

ایک آواز ان کے اندر سے بلند ہوئی، "وہ تمہیں نکال رہے ہیں اور تم رہنا چاہتے ہو۔ یہ رہنا بڑی ذلت کا ہے۔[9]

"آنسو جو بہہ نہ سکے" کے سماجی کردار

سماجی کردار کی اصطلاح نفسیات سے نکلی ہے۔ اس تصور کو ایک امریکی ماہر معاشیات نے بیسویں صدی میں پیش کیا۔ اس کا نام تیلی کوٹ پارسن تھا، جنھوں نے پہلی مرتبہ اس نظریے کے بارے میں بتایا۔ اس میں لوگوں کے روزمرہ معمول، عادات و خصائل، رویے اور سوچنے کے انداز کو دیکھا جاتا ہے۔ اس طریقہِ

تصور سے انسان نہ صرف اپنی ذات کو پہچانتا ہے بلکہ اس قابل بھی ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے انسان کے اندر چل رہی کشمکش کو جانچ سکے۔ اس سے کسی انسان کے کردار سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ جس سے ہمارے باہمی روابط اور توقعات کو پورا کیا جاتا ہے۔

بعض اوقات بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے ہم ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن سماجی کردار کی بدولت ادب پارے کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ نشاطفاطمہ کے سماجی کرداروں کو مختلف حوالوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔

لارڈ ہمفری کا کردار

لارڈ ہمفری ہندوستان جانے سے قبل اپنی بیوی کو بیٹھ کر کافی دیر تک سمجھاتا رہا کہ وہاں کے لوگوں کو کسی صورت بھی کم نہ سمجھے۔ ہندوستان میں رہنے والے باشندوں کے بارے میں اکثر یہ بات کی جاتی ہے کہ وہ لوگ غیر مہذب اور جنگلی قوم ہیں۔ لارڈ ہمفری نے پہلے سے ہے خبر دار کرنے کی کوشش کی کہ وہ لوگ جنگلی ہیں نہ ہی غیر مہذب۔ وہ مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ جو لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہوئے اور ہندوستان کے لوگوں کو کم تر سمجھا تو پھر وہ کسی کام کے نہ رہے۔ ان میں وہ لارڈز بھی شامل ہیں جو خود کو اعلیٰ قوم کا باشندہ ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اب وہ اپنے ذوق و شوق اور غلط فہمی کی بنا پر اپنی جاگیریں اور رتبہ کھو بیٹھے ہیں۔

> اسی خیال کے تحت یہاں سے بے کار قسم کے لارڈز جنھیں کچھ کرنے کو نہ تھا یا جو تنگ دستی کا شکار ہونے والے تھے۔ کیوں کہ جاگیریں ختم ہو گئیں تھیں، بھیجے گئے۔ اور ان کو جنگلی سمجھ کر جانوروں کی طرح ہنکارتے رہے۔ وہ یہ بھول گئے کہ وہاں دو قومیں ہیں۔ جب میں سے ایک اس ملک کی حاکم رہی ہے اور اس نے وہاں آٹھ سو برس حکومت کی ہے۔[10]

نشاط فاطمہ نے لارڈ ہمفری کا کردار ایسا تخلیق کیا ہے جس میں وہ ایک وقت میں دو ملے جُلے رویوں کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ ایک طرف تو وہ نو آباد کار ہی کی حیثیت سے ہندوستان جارہا ہے اور وہاں کے لوگوں پر اپنے احکام صادر کرے گا وہیں دوسری طرف وہ ہندوستانیوں کے لیے احساس بھی کر رہا ہے۔ ایک

وقت میں دو دورویوں کو ساتھ لے کر چلنا مشکل ہے۔ لیکن نشاط فاطمہ نے اس پیچیدگی کو اپنے کردار میں شامل رکھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نجم الُہدیٰ اپنی کتاب "کردار اور کردار نگاری" میں کہتے ہیں۔

> کسی افسانوی کردار اور واقعی انسانی میں مابہ لا امتیاز کیا ہے۔ غور و حوض سے کام لینے پر ہمیں دونوں طرح کے کرداروں میں جو حدِ فاضل سی نظر آتی ہے۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جو عملِ تخلیق کے دوران فنی تقاضوں کے تحت رونما ہوتی ہیں۔ وہیں تخلیقی مراحل اور فنی تقاضے ان سطور کی علت نمائی ہیں۔[11]

آزادی کے دن جب قریب آرہے تھے تو لارڈ ہمفری بہت زیادہ خوش نہیں تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو۔ بلکہ وہ یہاں کے ماحول، آب وہوا اور خاص طور پر یہاں کے لوگوں کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ ہر لمحہ یہی سوچتے رہتے تھے اور پریشان رہتے تھے۔ ان کا اس سرزمین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ایک الگ اور مختلف ملک، ماحول اور رہن سہن کے عادی تھے۔ اس کے باوجود جب وہ ہندوستان آئے تو وہ یہاں آکر بہت خوش ہوئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی روح خالصتاً مشرقی ہے۔ وہ بہت جلد ہی یہاں کے ماحول میں گھل مل گئے تھے۔ ان کا عمومی طور پر رویہ بھی سب کے ساتھ اچھا ہوتا تھا۔ ہندوستان ان کی جنم بھومی تو نہیں تھی۔ مگر ان کو اس سے پیار اسی طرح تھا جیسے کسی انسان کو اپنی جائے پیدائش سے ہوتا ہے۔ لارڈ ہمفری کا اپنی جائے پیدائش پر تو اختیار نہیں تھا۔ مگر ہندوستان کے ساتھ محبت اور دل لگی میں انھوں نے اپنا مردہ جسم اس زمین کے حوالے کر دیا۔ اور عین اپنے بیٹے کی طرح ضد کر کے ایک مرتبہ کہا تھا۔

میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔[12]

اپنی ضد اور ہندوستان کے ساتھ محبت نے ان کو یہاں سے جانے نہیں دیا۔ بلکہ وہ ہوا جو لارڈ ہمفری چاہتے تھے۔ ان کو جو اس سرزمین کی آب وہوا پسند تھی، اسی ہوا میں انھوں نے اپنی زندگی کا آخری سانس لے کر خود کو ہمیشہ کے لیے اس زمین کے اندر گُم کر لیا۔

ایڈورڈ کا کردار

نشاط فاطمہ نے ایڈورڈ کا کردار مرکزی کردار کی حیثیت سے تخلیق کیا ہے۔ ان کے تخلیق کردہ کردار میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک مثالی کردار میں ہونی چاہیے۔ ایسا مثالی کردار جس کا کسی مذہب، تنظیم یا نظریے سے تعلق نہیں ہے۔ اس کا دھرم عیسائی، یہودی یا پارسی نہیں ہے۔ اس کا تعلق ہے تو "انسانی دھرم" سے ہے۔ وہ مذہب اور سماج میں انسانیت کا قائل ہے۔ اور انسانیت کا ہی پرچار کرتا ہے۔ نشاط فاطمہ نے اپنے کردار "ایڈورڈ" کو انسانی مذہب کا پیروکار بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے بارے میں لالہ ہر دیال رقمطراز ہیں۔

> یہ مذہب بلا تمیز نسل و مذہب "انسانی اتحاد" سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔۔۔۔ انسانیت میں دنیا کی سب قومیں اور نسلیں شامل ہیں۔ خواہ وہ گوری ہو یا کالی۔ سرخ ہو یا زرد۔ بھوری ہو یا گندمی۔ سب ہی نے اس کی ترقی میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا ہے۔[13]

ایڈورڈ کا کردار شانتی اور مکتی لیے ہوئے ہے۔ نشاط فاطمہ نے اس کردار کے ذریعے نو تاریخی عناصر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عیسائیوں کی دینی کتاب میں لکھا ہے کہ انسان کو نجات اور راحت حضرت عیسیٰ پر یقین رکھنے سے ہی ملتی ہے۔ مگر ایڈورڈ جب کبھی بھی یہ بات سنتا تھا تو عیسیٰ کی جگہ "اپنے آپ پر" کا لفظ اس کے دماغ میں آتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان اگر اچھے کام کرے گا تو اس کا ضمیر صاف اور روح پاک رہے گی۔ لیکن اگر اس کے متضاد ہو گا تو پھر انسان کو مکتی اور نجات کسی بھی عیسیٰ سے نہیں مل سکتی۔ اس کے لیے آپ کے دماغ اور روح کا پاک ہونا ضروری ہے۔ نہ کہ کسی مذہب کا پیروکار ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ ایڈوڈ اپنے چھوٹے بھائی پیٹر سے بہت مختلف تھا۔ وہ جتنا غیر مستقل مزاج اور با قاعدگی سے گرجے جانے والا پکا عیسائی تھا۔ ایڈورڈ کا کردار اس سے بلکل مختلف تھا۔ ایڈورڈ گرجے نہیں جاتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کے اندر ایک مستقل راحت اور ایک غیر معمولی ٹھہراؤ سا تھا۔ جو بھی ایڈورڈ کو اچھی طرح سے جانتا تھا وہ اس بات کا قائل تھا کہ ایڈورڈ گرجا نہیں جاتا، مگر اس کے اندر ایک مکتی کا وعدہ ہے۔ جس نے اس کردار کو لازوال بنا دیا۔ ایڈورڈ نے جب مزید پڑھائی کے لیے برطانیہ کا رُخ کیا۔ مگر وہاں جا کر بھی اس کے اندر ٹھہراؤ بدرجہ اُتم رہا۔ وہاں کی بے لگام اور عیش پسند لڑکیاں بھی جب ایڈورڈ کو دیکھتی تھیں تو سوچتی رہتیں۔

> کیا یہ بھگت ہے۔ یہ ہندوستان سے آئے ہوئے انگریز اپنے اندر ایک عجیب طرح کا فلسفہ طاری رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ شاید برتر ہونا چاہتے ہیں۔ ہر شخص نئے رنگ میں آتا ہے۔ یہ بھی شاید بُدھ یا کرشن کے خیالات کا حامی ہو گا اور گیان کے فلسفے پر روشنی ڈالنے کا شائق۔[14]

ایڈورڈ برطانیہ جا کر بھی ہندوستان کے ماحول اور وہاں کے لوگوں کے طرزِ معاشرت کو فراموش نہ کر سکا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس بھاگتی دوڑتی دُنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کا تعلق تو بہت دور ایک سر سبز اور خوبصورت خطے سے تھا۔ اس کی روح اور اس کی سوچ اس نئے ماحول اور نئی دنیا کو اپنانے سے قاصر تھی۔ ایڈورڈ نے علی سے فرمائش کر کے ہندوستان سے آم منگوائے اور ہندوستانیوں کے انداز میں ہی کھاتا تھا۔ علی کے خط کے جواب میں اس نے جو لکھا اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اندر سے کس قدر مستقل مزاج شخصیت کا مالک تھا۔

> تم کیا کیا جاننا چاہتے ہو؟ میں تمھیں کہاں تک لکھوں ؟ یہاں تناؤ ہی تناؤ ہے جو پورے ملک پر طاری ہے۔ اس کے علاوہ خصوصاً ہمارے طبقے میں تصنع اور ریاکاری ہے۔ یہ لوگ طرح طرح کے لبادے اوڑھے رہتے ہیں۔ میں تو مدت بعد یہاں آیا ہوں۔ بچپن میں یہ ملک کیسا تھا، مجھے خیال نہیں۔ کوئی کُھلکے، بے تکلفی سے بات نہیں کرتا۔ لڑکیاں لڑکے پھانسنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔[15]

جب برصغیر کے دو ٹکڑے ہندوستان اور پاکستان الگ ہوئے تو 1947 میں انگریز کم و بیش تین سو سالوں کے بعد ملک چھوڑ کر گئے۔ برصغیر کو دو آزاد ممالک میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہندو اور سکھ ہندوستان میں جبکہ مسلمان مشرقی اور مغربی پاکستان میں جا کر آباد ہو گئے۔ لیکن 1947 کی جنگ آزادی اتنی آسانی سے نہیں ہوئی۔ بلکہ اس آزادی کے لیے بہت سے لوگوں نے جانی و مالی قربانیاں دیں۔ اور کوئی تو وہ بھی تھے جنھوں نے آزادی کے لیے اپنے گھر کی عزتوں کو قربان کرنا پڑا۔ لیکن دکھ اس بات کا تھا کہ ہندو اور مسلم اتنے لمبے عرصے ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر گزارے، مگر اس کے باوجود ان میں اتفاق قائم نہ ہو سکا۔ وہ جو جو انگریز نو آبادکاروں کی اجارہ داری اور ان کے مظالم سہہ سہہ کر عاجز آ گئے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کو ملک سے نکال

دیں۔ لیکن ان کو خود اس بات کا اندازہ نہیں ہوا کہ انگریزوں کو نکالتے نکالتے وہ خود ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا خون بہا کر خود کو برتر ثابت کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ خود کو برتر کرنے کے چکر میں انھوں نے جان دیکھی نہ مال۔ نشاط فاطمہ نے اپنے ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" میں ہجرت کے المیے کو برصغیر کی نو تاریخیت کو بیان کرتے ہوئے ان دونوں قوموں کے باہمی سلوک بتائے۔ جس کے سبب نہ صرف تقسیمِ برصغیر ہوئی، بلکہ سقوطِ ڈھاکہ کے واقعے کے نتیجے کے اسباب بھی ہندو مسلم چپقلش ہی تھی۔ جس کی وجہ سے نہ صرف برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہوا بلکہ پاکستان کے دونوں حصے (مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان) بھی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ آزادی سے پہلے بھی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ نشاط فاطمہ کا تخلیق کردہ مثالی کردار "ایڈورڈ" جو کہ نہ اس قوم کا باشندہ تھا اور نہ ہی اس ملک کا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ جب اپنی آنکھوں سے یہ دل خراش واقعات ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو اس کو بہت دکھ ہوا۔

> اے لوگو! کیوں لڑتے ہو؟ یہ داغ اپنی تاریخ پر کیوں لگاتے ہو؟ کچھ تو شرم کرو۔ جس قوم سے تم نے اپنا ملک واپس لیا تھا اور آزادی حاصل کی تھی، وہ تمہیں باہم دست و گریباں دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ اور ایک ہاتھ سے جو لکھ رہا ہے وہ مورخ کا ہاتھ ہے۔ اے لوگو! اس سے پناہ مانگو، آیندہ نسلیں تمہاری کرتوتوں کی وجہ سے سر نہ اٹھا سکیں گی۔[16]

نشاط فاطمہ کا تخلیق کردہ کردار ایسی خصوصیات کا مالک ہے جو اپنے سے دوسری قوم کے لیے بھی ایسے ہی دردِ دل رکھتا ہے جیسے کوئی اپنوں کے لیے رکھتا ہو۔

> اے خدا! رحم کرو اور انھیں عقل سے۔ یہ بہت بے وقوف ہیں، جھنجھلائے ہوئے ہیں اور غلامی کی محرومیوں کا غصہ ایک دوسرے پر نکال رہے ہیں۔[17]

نشاط فاطمہ نے اپنے مختلف کرداروں کے ذریعے سے جو کہانی بیان کرنے کی کوشش کی ہے وہی دراصل وجہ ہے سانحہ سقوطِ ڈھاکہ کے وقوع پذیر ہونے کی۔ چناں چہ ناول میں سقوطِ ڈھاکہ کی نو تاریخیت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان اسباب اور عوامل پر بھی غور کیا جاتا ہے کہ جن کے سبب پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ اس تقسیم کے پیچھے بھی کہیں نہ کہیں ہندو مسلم صدیوں سے چلی آ رہی چپقلش تھی۔ جس کے سبب آزاد

اور خود مختیار ہو جانے کے باوجود بھی ان کے باہمی اختلاف کم نہیں ہوئے اور ان کی ملی جلی سازشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ آج بھی پاکستان کی عوام میں یہ احساسِ کمتری ہے کہ اس کے دونوں حصے ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے ہیں۔ کچھ مسلمان پاکستان میں رہائش پذیر ہیں تو کوئی بنگلہدیش میں رہ رہے ہیں۔

زہرہ کا کردار

نشا فاطمہ کے ناول میں ایک کردار "زہرہ" کا بھی ہے جو بنیادی طور پر بنیادی طور پر ناول کی ہیروئین ہے۔ زہرہ کا کردار بہت دلچسپ ہے۔ وہ اپنے سماج اور معاشرے کے منفی رویوں سے عاجز ہوتی ہے اور ناول میں جابجا اس بات کا اعتراف بھی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نشاط فاطمہ کا یہ کردار سانحہِ سقوطِ ڈھاکہ کے پسِ منظر میں تخلیق کیا گیا کردار ہے۔ اس کردار کے ذریعے سانحہ سقوط ڈھاکہ کی نو تاریخیت کے بیان سے وہ اسباب ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے سبب بعد میں پاکستان دولخت ہو گیا۔ اس کردار کے تخلیق کرنے کا مقصد معاشرے کی منفی اور ناجائز نقطہ نظر کی تصویر کشی کرنا ہے۔ تاکہ معاشرے کو بہتر بنایا جاسکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک معاشرہ بہتر نہیں ہو گا، تب تک کوئی بھی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ اگر معاشرہ ٹھیک ہو گا تو وہ اسباب ہی پیدا کیوں کر ہوں گے، جس سے قوموں میں آپس میں بگاڑ پیدا ہو۔

نشاط فاطمہ نے زہرہ کا کردار مکمل تخلیق کیا ہے۔ جو جو خوبیاں ایک مثالی ہیروئین میں ہونی چاہیں، وہ سب زہرہ میں موجود ہیں۔ زہرہ کا کردار کسی سیاسی یا نظریاتی پارٹی سے نہیں ہے مگر اس سب کے باوجود اس کا کردار مثالی حیثیت کا ہے۔ کیوں کہ ناول میں نشاط فاطمہ نے زہرہ کے کردار کے ذریعے سے معاشرے میں موجود خامیوں اور خلاؤں کی نشان دہی کی ہے۔ جس کو بہتر بنانے سے نہ صرف لوگوں کا آپس میں میل جول اچھا ہو گا بلکہ اس سے قوموں کو بھی فائدہ ہو گا۔ زہرہ کا کردار ایک نیک سیرت اور اچھے اوصاف کی مالک لڑکی کا ہے۔ جس کی ماں اس کے دادا سے زمین دھوکے سے اپنے شوہر کے نام لگوالیتی ہے اور بعد میں لوگوں کو کہتی ہے کہ اپنے سسر کی خدمت کے عوض انھوں نے خود یہ زمین اپنے بیٹے جو وکیل صاحب ہیں، ان کے نام کروائی ہے۔ لیکن زہرہ نے یہ تمام واقعہ اپنے حوش سنبھالنے کے ساتھ ہی دیکھ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کو

بخوبی اندازہ تھا کہ یہ زمین انھوں نے کس طرح دھوکے سے اپنے نام کروائی تھی۔ زہرہ کا کردار ایک حساس لڑکی کا ہے جو اپنے سامنے ہونے والی کسی بھی زیادتی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر اس بار بات اس کی اپنی ماں کی ہے جس نے اس کو اس دنیا میں جنم دیا۔ تو اس ماں کے سامنے وہ کیوں کر بولتی۔ مگر اپنے دل کی بھڑاس کہیں نہ کہیں تو بہر حال نکالنی ہی تھی۔ چناں چہ وہ اپنے ماموں زاد علی اکبر بھائی کے پاس جا کر گلہ کرنے چلی گئی۔

> یہ جائیداد، روپیہ پیسہ، بڑی بڑی چیزیں ہیں۔ ہماری مائیں ہمیں سچ بولنا اور ایمان داری سے چلنا سکھاتی ہیں۔ اور خود یہ تمام قاعدے توڑ دیتی ہیں۔ جب انھیں ہم خدا کا درجہ دینے لگتے ہیں تو وہ اس درجے سے اُتر آتی ہیں۔ کہ ہم سے بھی چھوٹی ہو جاتی ہیں۔[18]

اس ناول کی اہمیت کچھ اس وجہ سے بھی ہے کہ نشاط فاطمہ نے اس ناول میں ایک محبت کی کہانی کو بھی شامل کیا ہے۔ تاکہ قاری ہر طرح کے موضوع کو پڑھ کر محضوض ہو سکے۔ محبت کی کہانی تو ویسے بھی ایسی کہانی ہوتی ہے جس سے قارئین کی دلچسپی بڑھتی رہتی ہے اور ان کا دھیان مکمل طور پر کہانی پر ہی رہتا ہے۔ لیکن نشاط فاطمہ کے ناول کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے کسی قسم کی روائتی محبت کی داستان نہیں لکھی۔ جو آج تک یا آج سے پہلے تک کے زیادہ تو مقبول مصنفین لکھتے ہیں۔ بلکہ ان کے ناول میں جو محبت کی کہانی پیش کی گئی ہے وہ بلکل خاموش محبت ہے۔ جس کے بارے میں ان دو محبت کرنے والوں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ محبت ایسی ہے جس میں کوئی عہد و پیماں نہیں، کوئی جذباتی وعدے نہیں، کوئی ساتھ جینے مرنے کی قسمیں نہیں ہیں۔ بلکہ اس ناول میں مصنفہ نے ایسی محبت کے بارے میں لکھا ہے جو ہر وعدے اور ہر قسم سے بالاتر ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ مخلص اور ایمان دار ہے۔ جس میں کسی قسم کا دھوکہ یا فریب نہیں ہے۔ نشاط فاطمہ نے اپنے ناول میں محبت کرنے والے کردار بہت ہی دلچسپ بنائے ہیں۔ ایک کردار زہرہ کا ہے جو ایک مسلمان لڑکی ہے اور دوسرا کردار "ایڈورڈ" کا ہے جو ایک نو آبادکار کا لڑکا ہے۔ لیکن نو آبادکار ہونے کے باوجود بھی ان دونوں کی محبت ہر طرح کے مطلب اور غرض سے پاک ہے۔ لیکن ایک بات جو قابلِ غور ہے وہ یہ کہ نشاط فاطمہ نے اپنے ناول میں ایک مسلمان مشرقی سوچ رکھنے والی لڑکی اور ایک انگریز لڑکے کی محبت کی داستان لکھی ہے۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ بہت مخلص ہیں۔ ایسی محبت جس میں ایک کی وجہ سے کبھی دوسرے کو تکلیف نہیں ہوئی۔

"آنسو جو بہہ نہ سکے" کے مذہبی کردار

نشاط فاطمہ نے اپنے ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" میں اپنے ناول میں جہاں سیاسی اور سماجی کرداروں کی تخلیق کی وہیں انھوں نے مذہبی کرداروں کو بھی بنایا۔ جس میں انھوں نے مذہبی کرداروں کی مدد سے اس ناول کو مقبولیت کی معراج کو پہنچایا۔ مصنفہ نے اس میں ایڈورڈ کا کردار تخلیق کیا ہے، جو ایک انگریز ڈاکٹر ہے۔ جو خود کو کسی بھی مذہب کا پیروکار نہیں مانتا، ماسوائے انسانیت کے مذہب کے۔ ان کا کہنا تھا کہ "بیمار انسان کو شیشے کے برتن کی طرح اٹھانا چاہیئے"۔[19]

اس کے علاوہ ایک کردار "علی اکبر" بھائی کا ہے، جو زہرہ کو اپنے ماں باپ کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرنے پر سمجھاتا ہے۔ اور سمجھاتے ہوئے وہ قرآنی حوالہ بھی دیتا ہے۔

> یہ جہاں کا غم تم کیوں لیے پھرتی ہو۔ بری بات ہے، اپنے ماں باپ کے خلاف کبھی کچھ نہیں کہا کرتے۔ تم نے بھی قرآن شریف میں پڑھا ہو گا کہ والدین کی محض عزت اور خدمت کرو۔[20]

"چلتا مسافر" کے عمومی کردار (سیاسی، سماجی، مذہبی)

چلتا مسافر میں الطاف فاطمہ نے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو ناول کی مقبولیت میں اہم کردار ادا کرتے نظر آئے۔ اس ناول میں الطاف فاطمہ کی تخلیق کردہ کردار سیاست میں بھی پیش پیش رہے اور ساتھ ہی ساتھ دیگر معاملات زندگی میں بھی بہت پر جوش نظر آئے۔ الطاف فاطمہ کے تمام کردار ایک سے بڑھ کر ایک خصوصیت کے مالک ہیں۔ ان کے ناول کے کردار بنیادی طور پر جاگیر دارانہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر حالات اور ملکی سیاست کے پیشِ نظر انھیں بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن مصنفہ کے تخلیق کرداہ کردار ناول میں ہر قدم پر ثابت قدم نظر آئے۔ الطاف فاطمہ کت کرداروں کے حوالے سے "ڈاکٹر ممتاز احمد خان" کہتے ہیں۔

"الطاف فاطمہ" نے ایسے بنگالی کردار بھی پیش کیے ہیں جو آخر وقت تک پاکستان سے محبت کا ثبوت دیتے ہیں۔ بالخصوص بذل الرحمن، مرلی اور گھنشیام جو آدرش پسندی کو اپنے اعلیٰ کردار سے مہمیز لگاتے ہیں۔ بالخصوص بزل الرحمٰن جا اپنی بساط بھر بہاریوں کو قتل ہو جانے سے تحفظ فراہم کرتا ہے اور خود بھی اپنی جان کو انتہا پسندوں کے آگے مستقل خطرے میں ڈالے رکھتا ہے۔[21]

کردار بنیادی طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ مرکزی کردار اور ضمنی کردار۔ مگر الطاف فاطمہ کے ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ناول میں خواہ کردار و مرکزی ہوں یا ذیلی، مگر کہیں بھی قاری کی توجہ نہیں ہٹاتے۔

"چلتا مسافر" کے سیاسی کردار:

الطاف فاطمہ کے ناول "چلتا مسافر" میں کرداروں کی مدد سے 1947 میں ہونے والے سیاسی واقعات کو بھی زیر قلم کیا۔ ان واقعات میں الطاف فاطمہ نے ہجرت اور فسادات کے بیان کو اپنے کرداروں کی مدد سے اس قدر خوبصورتی سے بیان کیا، جس کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ ناول کے مرکزی کردار "سید مبشر" ہیں جو نہ صرف مسلم لیگ کے سرگرم رکن ہیں بلکہ تحریک پاکستان کے بھی پرزور حامی ہیں۔ انھوں نے اپنے قائد کے دکھائے گئے خواب کے لیے دن رات کوششیں کیں اور پاکستان کے حصول کے لیے اپنوں اور غیروں سب کے ساتھ مخالفت کی۔ انھوں نے پاکستان کو بنانے کے لیے بہت تگ و دو کی۔ سید مبشر کی بیگم بھی ان کے اس خواب کو دیوانے کے خواب سے زیادہ نہیں سمجھتی تھیں۔ کیوں کہ ان کو لگتا تھا کہ یہ محض خواب ہے جو کبھی سچ نہیں ہو سکتا۔ ایک مرتبہ سید مبشر نے ان کو کہا۔

> یہ خواب میں نے اکیلے تو نہیں دیکھا۔ یہ تو میری قوم کا وہ فیصلہ ہے جسے خیبر سے راس کماری تک کے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔[22]

سید مبشر پاکستان بنانے والوں میں سب سے زیادہ پیش پیش رہے۔ انھیں پاکستان کے بننے کا پورا یقین تھا اور اس یقین کو انھوں نے کچھ اس طرح سے بیان کیا۔ "تم دیکھنا پاکستان تو ضرور بنے گا" [23]۔ سید مبشر کو نا صرف گھر والوں کی طرف سے مخالفت تھی بلکہ اپنے قریبی دوستوں اور جان پہچان والوں کو بھی پاکستان بننے کا یقین نہیں

تھا۔ غلامی کی گزشتہ زندگی نے ان کے ذہنوں کو اس قدر مفلوج بنا دیا تھا کہ وہ ایک آزاد ریاست یا آزاد ملک کے خواب کو بند آنکھوں سے بھی نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ ان کی سوچ اس معجزے کے ہونے کو ہر گز بھی قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ چناں چہ وہ لوگ جو پاکستان بنانے کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، ان کی محنت کو نہ کوئی سراہ رہا تھا اور نہ ان پر کوئی یقین کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے ایک نیشنلسٹ دوست امیر حیدر ایک مرتبہ ان کے گھر آئے اور انھیں شکار کے دوران سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ آزادی کے اس راستے کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں۔ مگر مبشر صاحب نے ان کو وضع دارانہ جواب دیا۔

> امیر حیدر تم سمجھتے ہو میں یا بہار کے تمام زمیندار اور مقتدر گھرانے نتائج سے بے خبر ہو کر پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں۔ ہم کسی خیالی جنت میں نہیں بیٹھے ہیں۔ یہاں پر ہماری تہذیبی اور مذہبی زندگی کی آبروانہ ضمانت اب اسی صورت میں ملے گی کہ جب مسلم اکثریت کے صوبوں کو حق خودداری مل جائے گا۔[24]

الطاف فاطمہ نے سید مبشر کا کردار بہت اعلیٰ اقدار کا تخلیق کیا ہے۔ سید مبشر ایک وضع دار کردار کی حیثیت سے ناول میں نمایاں نظر آتے رہے۔ سید مبشر ایک تحمل مزاج شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے متحمل مزاج ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک دور اندیش انسان ہیں۔ معاملات کو باریک بینی سے دیکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ پہلے سے ہی جانتے تھے کہ ان کو اس راستے پر اس طرح کے مسائل اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ جانتے تھے کہ اس راستے میں ان کو اپنے بہت سے لوگ ملیں گیں جو ان کو اس راستے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گیں۔ انھوں نے اس بات کا اظہار اپنے بیٹے مزمل سے بھی کیا۔

> ہاں ہاں، وہ پکے نیشنلٹ ہیں۔ لیکن مزمل، اس سے میری دوستی میں فرق پڑ سکتا ہے اور نہ میرے کاموں میں۔ تم کو معلوم ہے کہ اب ہمیں قدم قدم پر مورچے ملیں گیں۔ جن میں بے شمار ہمارے اپنوں کے ہی تیار کیے ہوئے ہیں۔ ہمیں ہر محاذ پر مقابلہ کرنا ہے۔[25]

الطاف فاطمہ کے کرداروں کی خاصیت یہی ہے کہ وہ آدرش پسند ہیں اور یہی آدرش پسندی ان کے ناول کے کرداروں میں جابجا نظر آتی ہے۔ الطاف فاطمہ نے معاشرے کے ہر طبقے سے کرداروں کو تخلیق

کیا۔ خواہ وہ زمیندار گھرانا ہو یا کوئی مفلس طبقے سے تعلق رکھنے والا فرد ہو۔ چناں چہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ الطاف فاطمہ کے کردار اصل زندگی سے ہی لیے گئے ہیں ہم اپنے ارد گرد بھی ہنستا، بولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان کے کردار بھی اچھائی اور برائی کے امتزاج سے مل کر بنے ہیں۔ الطاف فاطمہ کا ہر کردار اپنی جگہ منفرد اور دلچسپ ہے۔ الطاف فاطمہ کے تمام تر کرداروں میں نفسیاتی کشمکش نظر آتی ہے، کیوں کہ مصنفہ نے اپنی کہانی میں اصل زندگی کی چھاپ چھوڑنے کی کوشش کی ہے، ان کے کردار انسانی نفسیات اور ان کے تقاضوں پر پورا اترتے ہیں، جس سے ان کے کردار حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ جس سے ان کے کردار فطری طور پر مضبوط نظر آتے ہیں، جس سے وہ قاری کے ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ الطاف فاطمہ کے تمام ناول حقیقت نگاری کی اساس پر مبنی ہیں۔ "چلتا مسافر" کے کرداروں کے حوالے سے "ڈاکٹر زینت افشاں" اپنی کتاب میں کہتی ہیں۔

> مصنفہ نے نہایت فن کاری سے باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ ایک امیرانہ ٹھاٹ باٹ رکھنے والا گھرانہ کس طرح آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اور ہر طرح کی قربانیاں دیتا ہے۔[26]

"چلتا مسافر" کے سماجی کردار

الطاف فاطمہ نے ناول "چلتا مسافر" میں اس دور کے سماج کی عکاسی کی ہے، جس میں فسادات اور ہجرت جیسے واقعات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ آزادی کی اس جنگ کے نتیجے میں جو مسائل سامنے آئے اور انسان کی ذہنی کشمکش کو مصنفہ نے اپنے ناول میں کرداروں کی مدد سے نو تاریخیت کے تناظر میں ان واقعات کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔ الطاف فاطمہ کے کرداروں نے مل کر ایک خوبصورت کہانی ترتیب دی۔ الطاف فاطمہ نے ہجرت اور فسادات کے کے نتیجے میں انسان کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کو ناول میں کرداروں کی مدد سے قارئین کو اس دور کے سماج سے آشنا کروایا۔ ناول میں مصنفہ نے ایک ایسے نسوانی کردار کے جذبات اور احساسات کو بیان کیا ہے، جس کی حال ہی میں شادی ہوتی ہے۔ جو شادی کے فوراً بعد تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والے پے در پے واقعات سے بیک وقت گزر رہی ہے۔ ابھی وہ اپنی نئی زندگی کی تبدیلیوں کو بھی نہیں

سمجھ سکی تھی کہ سماج میں رونما ہونے والی تبدیلی نے اس کو متاثر کیا اور اس سب کا اس کی ذات پر کس طرح اثر پڑ رہا ہے وہ اس بات کو اپنے شوہر کے سامنے بے بسی سے بیان کرتے ہوئے کہتی ہے۔

> تم کو نہیں معلوم، جب انسان کی زندگی میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو وہ بکھر جاتا ہے۔ اس کے اندر کا پہلا انسان پر جاتا ہے۔ نہ کہیں جنازہ اٹھتا ہے اور نہ کہیں مزار بنتا ہے۔ مگر وہ مر جاتا ہے۔ پھر اس مرقد کی ذات سے ایک نئی ذات کی تعمیر کرتا ہے۔ افوہ شہزاد! اب میں تم کو کیسے دکھاؤں کہ میں کتنی بکھر رہی ہوں، کتنی رہزہ ریزہ ہو رہی ہوں۔ تم کیوں نہیں سوچتے کہ میں کایا کلپ کے عمل سے گزری ہوں۔[27]

لیکن جوں جوں وقت نزدیک آتا جاتا ہے اور فسادات اور دنگے دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں تو زہرہ بہت افسردہ ہوتی ہے۔ بالآخر وہ دن بھی آجاتا ہے جب وہ لوگ ہجرت کے لیے سامان اکٹھا کرنے لگتے ہیں، کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب ان کو ہندوستان چھوڑ کر اپنے آزادانہ ملک "پاکستان" میں زندگی گزارنی ہے۔ لیکن وہ سب خوش ہونے کے ساتھ ساتھ دکھی بھی ہوتے ہیں کیوں کہ وہ یہاں اس ملک میں اپنے پیاروں، اپنی یادوں، اپنے خوابوں اور خاص طور پر اپنے باپ دادا کے گھر کو چھوڑ کر جانے لگتے ہیں۔ اس گھر کے ساتھ ان تمام لوگوں کی یادیں وابسطہ ہیں اور زہرہ کا کردار جو کہ ابھی حال ہی میں بیاہ کر اس گھر میں لائی گئی تھی۔ وہ اس کم وقت میں بھی اس گھر سے مانوس ہو گئی تھی اور گھر کو چھوڑتے وقت اس کی حالت بھی عجیب ہو رہی تھی۔ وہ نہ صرف اپنے لیے افسوس کر رہی تھی بلکہ اس گھر میں رہنے والے مکینوں کے لیے بھی وہ افسردہ تھی۔

> زہرہ کا خیال تھا کہ اس گھر سے، جس کی دہلیز پر بے جی نہ صرف خود بیاہ کر آئی تھیں بلکہ اس کو بھی بیاہ کر لائی تھیں، نکلتے وقت بے جی ایک کہرام مچا دیں گیں۔ لیکن ان کے اتنے اوسان ہی کب باقی رہے تھے۔۔۔۔ وہ تو خود اپنے سر پر چادر لینا بھی بھول گئیں تھیں۔[28]

الطاف فاطمہ نے اپنے کرداروں کو تخلیق کرتے وقت انتہائی غیر جانبداری اختیار کی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں مختلف قسم کے انسانوں کو دیکھا اور ان کا مشاہدہ کیا، اور اسی مشاہدے کی بنا پر ہی انھوں نے اپنے کرداروں کو تخلیق کیا۔ انھوں نے کوئی مافوق الفطرت یا ماورائی کردار نہیں بنائے بلکہ اصل زندگی کے چلتے

پھرتے کرداروں کو ناول میں پیش کیا۔ ناول میں مصنفہ نے صرف ایک المیہ پیش نہیں کیا بلکہ دو دل خراش المیہ واقعات کو بیان کیا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان کے دو حصوں میں آباد ہونے والے مسلمانوں میں جو مغربی پاکستان میں رہے وہ اب آرام اور سکون کے ساتھ زندگی کزار رہے تھے۔ مگر وہ لوگ جن کے مقدر میں مشرقی پاکستان میں رہنا نصیب ہوا، ان کے لیے ابھی ایک اور امتحان باقی تھا۔ پہلے ہندوؤں کے مظالم اور اب بنگالیوں کے ہاتھوں ظلم برداشت کونے کے بعد وہ خاندان جو پہلے آزادی کی جنگ میں اپنوں کو کھو کر یہاں آیا تھا ان کے لیے اب بھی مسائل باقی تھے، اور ان ایک کے بعد دوسرے دل خراش واقعے نے اس سماج میں رہنے والے لوگوں کے ذہنوں کو عجیب قسم کے ذہنی انتشار میں ڈال دیا تھا۔

> میں قطعی ہوش و حواس میں ہوں۔ لیکن زندگی کے خاموش تسلسل نے مجھے بوکھلا دیا ہے۔ زندگی کے شام و سحر میں جب جب خاموش یکسانیت اور مربوط تسلسل قائم ہوا۔ میرا دل گھبرایا ہے۔ وہاں بھی ایسا ہوا ہوتا تو میں گھبرایا پھرتا تھا۔ زندگی کے معاملات سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔[29]

"چلتا مسافر" کے مذہبی کردار

ناول میں الطاف فاطمہ نے مذہبی کرداروں کی مدد سے بھی سقوطِ ڈھاکہ اور تقسیم ہند کی نو تاریخیت بیان کی ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ رہ رہ کر چھوٹی اور بڑی ذاتوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے بڑھتے اس قدر پہنچ گئے کہ بعد میں وہ سقوط کا سبب بنے۔ ان رویوں اور خامیوں کو مصنفہ نے اپنے کرداروں کی بدولت قارئین ادب کے سامنے پیش کیا۔ الطاف فاطمہ کے ناول میں انھوں نے ان مذہبی رویوں کا ذکر کیا ہے جس کا ذکر ہمیں "آنسو جو بہہ نہ سکے" میں نظر آتا ہے۔ کیوں کہ دونوں ناولوں میں اس سماج کی عکاسی کی ہے جس میں انسان کو پرکھنے کے لیے مذہبی اقداروں کی بجائے ذاتوں اور تفرقات کے پیرائے میں پرکھا جاتا تھا۔

مصنفہ نے اس ناول میں بھی اس بات کا ذکر کرتے ہوئے مختلف کرداروں کو تخلیق کیا جنھوں نے خود کو ذات پات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایسے میں مصنفہ نے وہ کردار بھی تخلیق کیے جو فرقہ واریت کو گناہ سمجھا۔ اس میں سید مبشر کا کردار ایسا ہی انصاف پسند اور مذہبی اصولوں کو مد نظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔ جس میں وہ اپنی بیگم کے سادات کے گھرانے سے تعلق ہونے پر فخر کرنے سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "میں مسلمانوں میں ذات پات کا تفرقہ ڈال کر گناہ گار کیوں بنوں"[30]

الطاف فاطمہ نے نصیبا کا کردار بنایا جس کو اپنے شوہر کے مرنے کے بعد زمانے میں بہت سے مسائل سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس میں سب سے بڑا مسئلہ اس کے لیے بیوہ ہونا ہوتا ہے۔ کیوں کہ بیوہ ہونے کے بعد لوگ اپنی خوشیوں سے نصیبا کو دور رکھتے ہیں۔ جبکہ نصیبا بہت چھوٹی سی ہی عمر میں ہی بیوہ ہو جاتی ہے۔ لیکن کئی سال گزرنے کے بعد بھی نصیبا کے لیے وہی ہندوآنہ رسوم کو روا رکھا گیا جو اس وقت برصغیر میں ہندوؤں نے اپنے لوگوں کے لیے رائج کیے ہوئے تھے۔ نصیبا کو سفید لباس اور سادہ حلیے میں ہی رکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گھر کی شادی میں، جہاں نصیبا سجنا سنورنا چاہتی تھی لیکن بیگم صاحبہ اور محلے کی دوسری عورتوں نے اس کو ایسا کرنے سے بعض رکھا۔ جس پر سید صاحب نے کہا۔ "بناؤ اس کے رنگین کپڑے۔ بچی ہے۔ آخر اس کا بھی دل چاہتا ہو گا۔"[31]

اس کے علاوہ سید مبشر کی والدہ "دادی بیوی" کا کردار بھی مصنفہ نے پیش کیا۔ جس میں نصیبا کو گھر کی بیٹی کی شادی میں نہیں آنے دیا جا رہا تھا اور اس کی آمد کو بدشگونی کی علامت سمجھا جا رہا تھا۔ یہاں پر دادی بیوی کا کردار اس قدر مضبوط کردار بن کر سامنے آیا اور انھوں نے اس کی حمایت کی اور اس معاملے میں اپنی رائے دی۔

"اے کچھ نہیں ہووت ہے۔ سب ڈھکوسلا بازی ہے۔ ہندوؤں کی۔ اری او نصیبا چل آ اور بیٹھ ادھر۔"[32]

غرض یہ کہ یہ تمام تر واقعات وہ ہیں مسلمانوں کے اندر ہندوؤں کے ساتھ اتنے سال اکٹھے رہنے کی وجہ سے آئے۔ چناں چہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں میں جو ذات پات اور فرقوں نے جنم لیا اس کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان مسائل نے جنم لیا جو بعد میں نہ صرف تقسیم پاکستان کی وجہ بنی بلکہ بعد

میں سانحہ سقوطِ ڈھاکہ کی وجہ بنا۔ ناول نگار خواتین کے کرداروں کی مدد سے اس دور کا نو تاریخی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات، مرتبہ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ادارہ فروغِ قومی زبان 2018، ص145

2۔ اردو لغت (تاریخی صورتوں پر)، جلد چہارم، ترقی اردو بورڈ، کراچی، 1992، ص78

3۔ اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجزیات، ڈاکٹر، فوزیہ اسلم، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2007، ص20

4۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، دارالنور، لاہور، 2003، ص147

5۔ خیال امروہی، ڈاکٹر۔ مترجم، لغات سماجی علوم و فلسفہ، یو پبلیکیشنز، اردو بازار، لاہور، 2008، ص58

6۔ نشاط فاطمہ، آنسو جو بہہ نہ سکے، فیروز اینڈ سنز لمیٹڈ، بارسوئم، 1976، ص17

7۔ ایضاً۔ ص44

8۔ ایضاً۔ ص205

9۔ ایضاً۔ ص206

10۔ ایضاً۔ ص،19

11۔ نجم الہدایٰ، ڈاکٹر، کردار اور کردار نگاری، بہار اردو اکادمی، 1970، ص45

12۔ نشاط فاطمہ، آنسو جو بہہ نہ سکے، فیروز اینڈ سنز، 1971، ص207

13۔ لالہ ہر دیال، مذاہب اور انسانیت، لاجپت رائے اینڈ سنز پبلیکیشنز اینڈ بک سیلرز، 1937، ص250، 252

14۔ نشاط فاطمہ، آنسو جو بہہ نہ سکے، فیروز اینڈ سنز، 1971، ص81

15۔ ایضاً، ص82-83

16۔ ایضاً، ص211

17۔ ایضاً، ص213

18۔ ایضاً۔ ص60

19۔ ایضاً۔ ص،268

20۔ ایضاً۔ ص،61

21۔ ممتاز احمد، ڈاکٹر، "آزادی کے بعد اردو ناول"، فضلی سنز لمیٹیڈ، سال اشاعت، 1997، ص135

22۔ الطاف فاطمہ، "چلتا مسافر، فیروز سنز لمیٹیڈ، چوتھی اشاعت، 2016، ص25

23۔ الطاف فاطمہ، "چلتا مسافر، فیروز سنز لمیٹیڈ، چوتھی اشاعت، 2016، ص،26

24۔ ایضاً۔ ص،54

25۔ ایضاً، ص50

26۔ زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، سال اشاعت 2016، ص158

27۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، فیروز سنز لمیٹڈ، چوتھی اشاعت۔2016، ص،129 ص

28۔ ایضاً، ص،138

29۔ ایضاً، ص،171

30۔ ایضاً، ص،25

31۔ ایضاً۔ ص،33

32۔ ایضاً۔ ص،36

ماحصل

نو تاریخیت کی تھیوری ادبی متون کو پرکھنے کا نیا سلیقہ عطا کرتی ہے۔ نو تاریخیت تاریخ کے ان چند خفیہ خانوں کو بے نقاب کرتی ہے جو سیاسی، سماجی یا اخلاقی طور پر سامنے نہیں آسکتے۔ اس کا اولین مقصد تاریخی عمارت کے خفیہ رازوں کو بے نقاب کرنا ہے۔ چنانچہ وہ عہد جو کسی وجہ سے اپنے پہلے زمانے سے کٹا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو نو تاریخیت مقصد کی معراج تک پہنچاتی ہے۔ نو تاریخیت خواہ مابعد جدیدیت کی اہم تھیوری ہے مگر اس کے باوجود یہ ادب اور تاریخ کے متعین گروہی تصورات کو اہمیت دینے کی بجائے ادب اور تاریخ میں نئے رشتوں کو استوار کرنے پر زور دیتی ہے۔ نو تاریخیت میں بغور مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ غیر ادبی متون کو بھی پرکھا جاتا ہے۔ جن میں بشریات، نفسیات، اقتصادیات جیسے شعبوں کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ ادب اور تاریخ کو سمجھنے کے لیے ثقافتی مادیت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس کو اگر نو تاریخیت کی ذیلی شاخ کہیں تو یہ ہرگز غلط نہ ہوگا۔ اس میں متن کو سمجھنے کے لیے سیاسی تناظرات کی مدد لی جاتی ہے۔ سیاسی تناظر کی تفہیم سے کسی بھی عہد کے نو تاریخی پہلوؤں کو با آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ نو تاریخیت اردو ادب میں مختلف ادیبوں کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ الطاف فاطمہ اور نشاط فاطمہ کے ناولوں میں نو تاریخیت کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے ناولوں میں ''آنسو جو بہہ نہ سکے'' اور چلتا مسافر'' کو پڑھ کر تاریخ کے وسیع تناظر کا مطالعہ کرنے کو ملتا ہے۔ ان دونوں نے اسے موضوعات اور کرداروں کی مدد سے نو تاریخیت کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کو درپیش مسائل کا حل سیاسی، سماجی اور مذہبی اعتبار سے موجودہ دور سے نکال کر ماضی میں تلاش کیا۔ ان کے ناولوں کے کردار اور موضوعات سیاسی، سماجی اور مذہبی حوالوں سے نو تاریخی عناصر کو قارئین کے سامنے کھول کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن سال میں نو تاریخی عناصر ہمیں سقوطِ ڈھاکہ کے دل خراش واقعے میں پسِ پشت وجوہات کی طرف خاص طور پر مرکوز کرتے ہیں۔ منتخب ناولوں میں سقوط ڈھاکہ کے پیشِ نظر جو اسباب اور محرکات تھے اس کا بیان بھی کیا گیا ہے۔ ان ناولوں کا نو تاریخی تجزیہ ان کے موضوعات اور کرداروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سیاسی، سماجی اور مذہبی حوالے سے کیا ہے۔

منتخب ناولوں میں سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر کو کچھ مخصوص پہلوؤں کے تناظر میں موضوع بنایا گیا ہے اور مختلف ناقدین نے مخصوص حوالوں سے ہی اس کی وضاحت کی کوشش کی ہے۔ ان ناولوں کا نو تاریخیت کے تحت مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

الطاف فاطمہ کا ناول 'چلتا مسافر'' سقوطِ ڈھاکہ'' کے موضوع پر نہایت عمدہ ناول ہے۔ اس ناول میں ایک سید خاندان کی کہانی بیان کی گئی ہے جو پاکستان کا حامی ہے جو قربانیاں دیتا ہے مگر سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ کیسے انھیں آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اس کے محرکات کیسے سامنے آتے ہیں۔ نو تاریخیت کے تناظر میں اس کے سیاسی محرکات کے ساتھ ساتھ مذہبی اور سماجی محرکات بھی اہم ہیں۔ اس ناول میں سید خاندان کیسے اپنے وطن کی خاطر جدوجہد کرتا ہے۔ سید مبشر کے دونوں بیٹے وطن پر قربان ہوتے ہیں۔ ایک بیٹا فسادات میں جان کی بازی ہارتا ہے تو دوسرا مشرقی پاکستان میں موت کو گلے لگاتا ہے۔ وہ مذہبی بالادستی کا شکار ہوتا ہے۔ حتی کہ ایمان کے رکھوالوں کو جنازہ پڑھنے کے لیے بھی سماج سے الجھنا پڑتا ہے۔ جس سے اس وقت کے سماجی و مذہبی و سیاسی حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

الطاف فاطمہ کا ناول اپنے موضوعات اور کرداروں کے حوالوں سے قابلِ توجہ ہے۔ یہ ناول بیک وقت تاریخی، سیاسی، مذہبی اور سماجی پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول سقوطِ ڈھاکہ کے بہت سے نئے پہلو سامنے لاتا ہے۔ اس ناول کی نئی پڑھت اس کی نئی معنویت اور تفہیم سامنے لاتی ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بہت سے ایسے کردار سامنے آتے ہیں جو مسلمانوں اور پاکستان سے محبت سے بھرے ہوئے تھے مگر بہت سے اسباب نے مل کر نفرت کو ہوا دی اور ملک دولخت ہوا۔

دوسرا ناول ''آنسو جو بہہ نہ سکے'' نشاط فاطمہ کا ناول ہے جو تقسیم کے موضوع پر ہے۔ اس ناول میں ۱۹۳۷ کا زمانہ دکھایا گیا ہے۔ اس ناول میں ایک انگریز خاندان کی جدوجہد دکھائی ہے جو ہندوستان میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار لارڈ ہمفری ہے۔ اس کے علاوہ زہرہ اور ایڈورڈ کا کردار بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ خاندان آزادی کی جدوجہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اس ناول میں اس دور کی تاریخ، سیاسی و مذہبی پہلو دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

"چلتا مسافر" اور "آنسو جو بہہ نہ سکے" دونوں ناول تاریخی و سیاسی موضوع کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ اگرچہ دونوں ناولوں کا موضوعات سقوطِ ڈھاکہ اور تحریک آزاد سے جڑے ہوئے ہیں مگر جب ان ناولوں کا نو تاریخیت کے تناظر میں مطالعہ کیا گیا تو اس کے مختلف پہلو اور جہتیں سامنے آئی ہیں۔ موضوعاتی سطح پر ان ناولوں کے ثقافتی، سماجی، مذہبی اور سیاسی پہلو اور کردار نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ جہاں روایتی کردار سامنے آتے ہیں وہیں ایسے مثبت کردار بھی دلچسپ تاثر قائم کرتے ہیں۔ جیسے "آنسو جو بہہ نہ سکے میں ایڈورڈ کا کردار جو انگریزوں کے تسلط کو درست نہیں سمجھتا ہے اور اسے ہندوستانیوں کی سرزمین ہی تسلیم کرتا ہے۔ یہ خاندان ہندوستان میں انتخابات کو اور انڈیا ایکٹ کو بھی دیکھتا ہے۔ اس خاندان نے سمجھ لیا تھا کہ جلد انگریزوں سے حکومت چھن جائے گی اور مسلمان اور ہندو دوبارہ اقتدار حاصل کر لیں گیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر ہندوستان کو بیماریوں میں گھرا دکھایا گیا ہے جبکہ "چلتا مسافر" میں مختلف تحریکوں اور مذہبی رجحانات کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ آزاد کی تحریک کے بہت سے محرکات تھے۔ مذہبی آزادی یا مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک یا مسلمانوں کی حق تلفی۔ انگریزوں دہرا معیار۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں کو رعایات دینا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی پہلو بھی نو تاریخیت کے تناظر میں سامنے آتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ نو تاریخیت کی تھیوری کے تحت کسی متن کو ایک سے زیادہ تناظر میں پرکھا جاسکتا ہے۔ عام طور پر ایک تخلیق کار کسی موضوع کو ایک حوالے سے متن میں برتتا ہے۔ نو تاریخیت میں متن مختلف زاویوں سے پرکھا جاتا ہے جو مختلف جہتیں سامنے لاتا ہے۔ اس تحقیق میں بھی دونوں ناولوں کے مطالعہ میں نو تاریخیت کی تھیوری کے تحت مختلف زاویوں سے ناولوں کو پرکھا گیا ہے۔ دونوں ناولوں کا سماجی و سیاسی و موضوعاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناولوں کے کرداروں کو بھی تاریخ، سیاستی اور مذہبی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔

نتائج

1۔ نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ کے تخلیق کردہ ناولوں کے متن کا مطالعہ ناولوں کے موضوعات اور کرداروں کو سامنے رکھتے ہوئے نو تاریخیت کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ جس سے ناولوں میں پیش کیے گئے حالات وواقعات کھل کر سامنے آتے ہیں۔

2۔ نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ نے تحریک آزادی اور سانحہ سقوطِ ڈھاکہ کو اپنے ناولوں میں قلم بند کیا۔ ملک کی بدلتی صورت حال، سیاسی پالیسیاں، ہجرت کے واقعات اور لوگوں کی نفسیاتی الجھنوں کو پیش نظر رکھ کر سیاسی، سماجی اور مذہبی تناظر میں ناولوں کا تجزیہ کیا ہے۔ ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" میں واقعات کو اتنا مفصل انداز میں نہیں بتایا گیا۔ جبکہ "چلتا مسافر" میں سقوطِ ڈھاکہ کے واقعے کے نتیجے میں لوگوں کا بے گھر ہونا، ان کی مشکلات اور مشرقی پاکستان کی خاطر بہاری خاندانوں کی قربانیوں کو الطاف فاطمہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

چناں چہ موضوعات کے حوالے سے الطاف فاطمہ کا ناول خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ یہ ناول دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ ایک فصل میں تحریک پاکستان کی جدوجہد کا بیان ہے جبکہ دوسری میں سانحہ مشرقی پاکستان کی الم ناک داستان مصنفہ نے قارئین کے سامنے پیش کی ہے۔ جیسے مزمل کے گھر والوں کو مشرقی پاکستان میں ان کی زندگی اور اس سانحے کے بعد درپیش مسائل کو الطاف فاطمہ نے بہت عمدہ انداز میں تحریر کیا۔

3۔ دونوں ناولوں میں مصنفین نے مسلم، انگریز، ہندو اور بنگالی کرداروں کا بیان سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں ایک نئے پیرائے میں کیا ہے۔ خصوصاً "آنسو جو بہہ نہ سکے" میں انگریز باپ بیٹا کے کرداروں کے بارے یں لکھتی ہیں کہ باپ اپنی حکومت ختم ہونے کی وجہ سے مایوس ہے جبکہ اس کا بیٹا خوش ہے کہ اب سے یہ ملک کسی کی غلامی نہیں کرے اور یہاں کے لوگ آزادانہ زندگی گزاریں گے۔ جبکہ "چلتا مسافر" میں الطاف فاطمہ نے سید خاندان کے کرداروں کو آزادی کی جدوجہد اور مشرقی پاکستان کی خاطر قربانیوں کو پیش کیا ہے۔ کرداروں کی اس پیشکش میں دونوں مصنفین نے تعصب سے پاک رویے کو اختیار کیا ہے۔

سفارشات

1۔ نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ کے ناولوں میں سقوطِ ڈھاکہ کے واقعے کے اسباب و علل بیان کیے ہیں، جن کے سبب یہ سانحہ پیش آیا۔ تاہم فی الوقت سقوطِ ڈھاکہ پر لکھے جانے والے دیگر معاصرین کی تحریروں کو پرکھا جائے۔

2۔ نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ کے ناولوں میں ہجرت، فسادات اور تقسیم کے واقعات ملتے ہیں۔ لہذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے دیگر ناولوں اور افسانوں میں ان واقعات کو نہ صرف نو تاریخی حوالوں سے دیکھا جائے بلکہ جدید تنقیدی تھیوریز کے تناظر میں ان ناول نگار خواتین کے کام کو پرکھنے کی ضرورت ہے۔

3۔ نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ کے ناولوں کا تقابلی جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

نشاط فاطمہ، آنسو جو بہہ نہ سکے، فیروز اینڈ سنز لمیٹڈ، بار سوم، 1974

الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، فیروز اینڈ سنز لمیٹڈ، چوتھی اشاعت، 2016

ثانوی ماخذ:

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، بار اول، ۱۹۸۳ء

اشتیاق حسین قریشی، جدوجہد پاکستان، ناشر: شعبہ و تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامع کراچی، ۱۹۸۴

آغا سہیل، ڈاکٹر، ادب اور عصری حسیت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء

آغا محمد باقر۔ تاریخ نظم و نثر اردو۔ لاہور: برانچ کوآپریٹو کیپیٹل پریس، ۱۹۳۷ء

آل احمد سرور، نظر اور نظریے، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، بار دوم، ۱۹۸۲ء

انور پاشا، ڈاکٹر، ہندو پاک میں اردو ناول (تقابلی مطالعہ)، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

اے حمید، جب ڈھاکہ جل رہا تھا،

جاوید اختر، سید، ڈاکٹر، اردو کی ناول نگار خواتین، سنگ میل پبلکیشنز لاہور، ۱۹۹۷ء

حیات افتخار، ڈاکٹر، اردو ناولوں میں ترقی پسند عناصر، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، بار اول، ۱۹۸۸ء

رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، اُردو میں تاریخی ناول، ابلاغ لاہور، ۱۹۹۴ء

زاہد چوہدری، پاکستان کیسے بنا، ادارہ مطالعہ تاریخ، لاہور، ۲۰۱۲

سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو ناول نگاری، مکتبۂ جدید، لاہور، بار اول، ۱۹۶۰ء

سید علی حیدر، ڈاکٹر، اردو ناول سمت اور رفتار، شبستان، الہ آباد (انڈیا)، بار دوم، ۱۹۷۹ء

صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، الفیصل نشران و تاجران کتب، ایڈیشن 20، سنِ اشاعت 2007 جولائی

صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان کیوں ٹوٹا؟، مطبع 'جنگ پبلیشرز پریس، بار اول مارچ 1990

عتیق اللہ (مرتب)، بیسویں صدی میں خواتینِ اردو ادب، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء

علی عباس حسینی، ناول کی تعریف و تنقید، لاہور اکیڈمی، لاہور، بار اول، ۱۹۶۴ء

محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

محمد علی چراغ، تاریخ پاکستان، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲

محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹ء

ممتاز حسین، پروفیسر، ادب اور لاشعور، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۲ء

نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء

نسیم عباس احمر، ڈاکٹر (مرتب)، نو تاریخیت، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء

نشاط فاطمہ، آنسو جو بہہ نہ سکے، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۴ء

نعیم مظہر، ڈاکٹر / فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، (مرتبین)، اردو ناول تفہیم و تنقید، ادارہ فروغِ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء

نورین رزاق، ڈاکٹر، پاکستانی خواتین افسانہ نگار (اردو افسانے کی روایت کے تناظر میں)

نیر، ناصر عباس، ڈاکٹر، جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۴ء

نیلم فرزانہ، اردو ادب کی خواتین ناول نگار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۲ء

ہارون ایوب، اردو ناول پریم چند کے بعد، اردو پبلشرز، لکھنو، بار اول ۱۹۷۸ء

الیاس بابر اعوان (مترجم)، ادبی اور ثقافتی تنقیدی تصورات کا تعارف: بنیادی تنقیدی تصورات (تھیئری، تناظرات)، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد، بار اول، ۱۹۷۳ء